

6

# احساس کے گھاؤ

مع مقدمہ تبسم، ایم-اے

م-م صدیق

## احساس کے گھاؤ

یہ افسانوی مجموعہ محترمہ رُقیہ تبسّم، ایم۔اے اور جناب م۔م صدیق کی مشترکہ کوششوں کا ایک دلچسپ ادبی کارنامہ ہے۔ "احساس کے گھاؤ" کے ہر دو مصنفین جو انسال اور جواں فکر ہیں۔ میں نے اُن کے اس افسانوی مجموعہ کو نہائیت انہماک کے ساتھ پڑھا ہے اور میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اس افسانوی مجموعہ کا ہر افسانہ نہ صرف دلچسپ ہے، بلکہ یہ ہر افسانہ پڑھنے والوں کے دل پر اپنا کوئی نہ کوئی نقش چھوڑ جائے گا۔ مجھے اُمید ہے کہ اس افسانوی مجموعہ کو ادب دوست احباب بہت پسند فرمائیں گے اور یہ ادبی حلقوں میں مقبول ہو۔ میری خداوند تعالیٰ سے یہی دُعا ہے۔!

گلشن سمیلپوری

ہم ان تمام حضرات کا تہہ دِل سے شکریہ ادا کرتے ہیں جنہوں نے اس مجموعہ کو منظرِ عام پر لانے میں ہماری ہمت افزائی کی، اپنے زرین مشوروں سے نوازا ــــ !

خاص کر ہم کشمیری زبان کے شاعر منیر احمد منیر نوجوان افسانہ نگار شمس الدین تبسم، جوان سال مصور معراج الدین فراش اور ابھرتے قلم کار طاہر رحمان کے احسان مند ہیں، جن کے بھرپور تعاون سے "احساس کے گماؤ" آج آپ کے سامنے ہے ـــ !

ــــ رضیہ تبسم

ــــ م، م صدیقی

# نقشِ اوّل

آٹھ سال قبل میں نے ایک خواب دیکھا تھا — خواب، خواب ہی رہتے ہیں، حقیقت کے جامے نہیں اوڑھتے۔ اکثر خواب ایسے ہوتے ہیں — جن کے اثرات ذہنی دریچے پھلانگ کر زائل ہو جاتے ہیں اور کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کے نقوش ذہنی دیواروں پر تاعمر رہتے ہیں —

بات میرے آٹھ سالہ پہلے کے خواب کی ہو رہی تھی — وہ خواب آج "احساس کے گھاؤ" کی شکل میں آپ کے سامنے ہے۔ خواب اگر رنگین ہوں تو مزا ہی کچھ اور ہے میرا خواب تو بلیک اینڈ وائٹ تھا — لیکن محترمہ رقیہ تبسم نے اپنی تخلیقات سے اسے رنگین بنا ڈالا — !

محترمہ موصوفہ کی ادب دوستی اور خلوص نے مجھے اپنی اس دیرینہ خواہش کو ان کے سامنے رکھنے پر اکسایا انہوں نے میرے خواب کو حقیقت کے جامے اوڑھنے میں اپنا تعاون دینے کا یقین دلایا — !

وادیٔ گلپوش میں یہ اپنی نوعیت کا پہلا تجربہ ہے
جب دو متضاد صنف کے ذہن اس پر عمل کر رہے ہیں۔!
محترمہ رضیہ تبسم کی رضامندی حاصل کرنے کے بعد
میں نے اپنے کئی دوستوں کے سامنے اس خواب کے سپنے
بکھیرے، اُن کا چونک پڑنا ایک قدرتی فعل تھا۔ ظاہر ہے
کہ ہمدرد خوش ہوئے ۔۔!

مجھے اس بات کا بھی بخوبی احساس ہے کہ اس نئے
تجربے کو گندی ذہنیت کے اشخاص غلط رنگ میں پیش
کریں گے کیونکہ وادی میں ایسے اشخاص کی کمی نہیں ۔۔
لیکن اس کے ساتھ ساتھ مجھے یہ بھی یقین ہے کہ باشعور اور
ادب نواز اس نئے تجربے کی سراہنا کئے بغیر نہ رہیں گے۔

ہاں، جب "احساس کے گھاؤ" کا پیش لفظ
لکھانے کا مسئلہ سامنے آیا تو میں تذبذب میں پڑ گیا۔ دوستوں
نے کسی کہنہ مشق قلم کار سے رجوع کرنے کو کہا ۔۔ میری
نگاہوں کے سامنے کئی چہرے اُبھرے ۔ پر پل میں ہی ڈوبے!

میں نے سوچا ۔ "آفتاب براندہ ادیب" کے لئے
اُن تک پہونچنا موئنٹ ایوریسٹ کی چوٹی سر کرنے والی بات
ہے ۔۔ میں چوٹی تک پہونچ نہیں سکتا تھا اور وہ زمین پر

آ نہیں سکتے تھے ــ !

"آفتاب برانڈ ادیب" کا ذکر میں اس لئے لے بیٹھا کہ ہمارے "کہنہ مشق قلم کار" ہمیں پاس پھٹکنے نہیں دیتے! اُن کے نزدیک اخباروں کے قلمی معاون ادیب نہیں ہوتے!

قلم کار تو وہ ہے جو اپنی تخلیقات کو نوٹوں کی شکل میں ڈھالے ــ سکوں کی جھنکار پر ترنم سے گا سکے ــ یہ میرا خیال نہیں، اُن کہنہ مشق قلم کاروں کا ماٹو ہے ــ جو اس پر عمل کرتے ہیں اور کرتے رہیں گے ــ !

مجھے فخر ہے ــ میں "آفتاب برانڈ" ہوں ــ میری ادبی زندگی کا آغاز "آفتاب" سے ہوا، انجام خدا جانے ــ !!!

م، م جھکنیق

# اپنی بات

ادبی دنیا میں یہ میرا پہلا قدم ہے۔ مجھے احساس ہے کہ میری کہانیوں میں خامیاں بھی ہوں گی۔ لیکن یہ تو ابتدا ہے۔ پلاٹ بندی اور تیکنیکی لحاظ سے میری کہانیاں بہت پیچھے ہوں گی، کردار نگاری اور منظر کشی ٹھیک ڈھنگ سے نہ ہو سکی ہو گی۔ یہ میں جانتی ہوں۔ لیکن ساتھ ساتھ یہ بھی امید رکھتی ہوں کہ قارئین حضرات میری مختصر ادبی زندگی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے، مجھے اپنے زرین خیالات سے نوازیں گے، تاکہ میں آئندہ اپنی تخلیقات کو اُن خامیوں سے دُور رکھ سکوں۔!

یہ کوئی اچنبا نہیں۔ جو آپ میری کہانیاں "احساس کے گھاؤ" میں دیکھ رہے ہیں۔ در اصل اِس کا سہرا جناب م، م صدّیق کے سر ہے۔ جن کی ادب دوستی اور نیک نیتی کی میں حد درجہ قائل ہوں۔ ملنساری اور ادب دوستی کو وادئ کشمیر میں ہمیشہ سے غلط رنگ میں پیش کیا گیا۔ ممکن ہے یہ مجموعہ منظر عام پر آتے ہی ہم بھی اس کے شکار ہو جائیں۔ لیکن سچائی آخر کو سچائی ہے، صد پردے چاک کر کے عیاں ہو جاتی ہے۔!

میں یہ بتانا بھول ہی گئی کہ میں نے کئی کہانیاں "رابعہ دلشاد" کے نام سے بھی لکھی ہیں جو کہ روزنامہ "آفتاب" میں وقتاً فوقتاً چھپتی رہی

ہیں۔ ان میں سے چند ایک زیر نظر مجموعہ میں شامل ہیں۔ اصل نام سے
ہیں صرف چند کہانیاں اب تک لکھ چکی ہوں۔!
ہیں کوئی ادیبہ نہیں۔ جب بھی فرصت کے چند لمحے نصیب
ہیں تو بس کورے کاغذ کالے کر لیتی ہوں۔!

(رضیہ تبسم ۔ ایم۔ اے)

# پُل صراط کے راہی

میری بند مٹھی میں دبا ہوا دو روپے کا کٹا پھٹا نوٹ مجھے اپنے گھر کے اس چولہے کی یاد دلا رہا ہے جو کئی روز سے آگ کے شعلوں کو ترس رہا ہے، اس گرمی کو ڈھونڈ رہا ہے جو اسے کبھی کبھار ہی ملتی ہے۔

یہ کٹا پھٹا نوٹ، جس کی اس بیسویں صدی میں کوئی قیمت ہی نہیں۔ سیر بھر چاول کے دانے بھی پورے نہیں ملتے۔ ایک انسان ایک وقت پیٹ کی آگ بھی پوری طرح بجھا نہیں سکتا۔ لیکن میرے نزدیک یہ نوٹ دنیا بھر کی دولت سے بھی کہیں بڑھ کر ہے۔ کیونکہ میں نے اسے اپنے جسم کی گرمی کھو کر پایا ہے۔ تین انسانوں کی پیٹ کی آگ بجھانے کے لئے۔ میری شرم و حیا، چہرے کی رنگت، ہونٹوں کی سُرخی، غرض جسم کے ایک ایک عضو کی قیمت یہی کٹا پھٹا نوٹ ہی تو ہے۔!

بند مٹھی خود بخود کھل جاتی ہے۔ نوٹ پر چھپی ہوئی "باپو" کی تصویر حسرت و یاس میں ڈوبی ہوئی نظر آتی ہے۔ جیسے انہیں میرے لُٹ جانے پر گہرا صدمہ ہوا

ہو اور پھر "باپو" کی تصویر کی جگہ ذہن کے نہاں خانوں میں مِٹی مِٹی نقوش والی ایک تصویر لے لیتی ہے۔

بابا ـــــ یاس بھری تصویر مسکرا پڑتی ہے۔

"میں اپنی بیٹی کا بیاہ کسی شہزادے سے کروں گا ـــ"

اُن الفاظ کی گونج میرے کانوں میں اب بھی رَس گھول رہی ہے۔!

"ہٹیئے بابا، میں آپ سے نہیں بولوں گی۔" میں مصنوعی غصّے سے بولتی ہوں

"اچھا اچھا۔ ناراض نہ ہو بیٹی ـــ"

دھن ..... دھن ..... دھن ..... فائر کی آواز کے ساتھ ہی "باپو" کی مسکراہٹ دم توڑتی ہے۔ اپنے ہی بیٹے اس کی جان لے لیتے ہیں۔ بابا کی موت کا باعث اپنا ہی بیٹا بن جاتا ہے۔ شراب کے نشے میں دھت وہ یہ بھول جاتا ہے کہ اُس نے بابا کا کہا نہ مان کر اُس کی جان لی ہے اور خود شراب ہی اُسے زندگی کے انجام تک پہونچاتی ہے۔ "باپو" اور بابا کے قتل میں کوئی فرق نہیں۔ ایک گولی کا شکار ہوا اور دوسرے کی جان، بیٹے کے بُری عادتوں نے لی۔!

آنسوؤں کے چند قطرے ٹوٹ کر ترکر چکے ہیں۔ مجھے ایسا گمان گذرتا ہے ـــ جیسے باپو میری حالت دیکھ کر رو پڑا ہو۔ اپنی بیٹی کو بکتے دیکھ کر بابا کی آنکھیں بھیگ چکی ہوں۔

میں آج جی بھر کے رونا چاہتی ہوں ـــ یہ آنکھوں میں آنسو نہیں جنہیں اپنی بیتی زندگی کے نذر کروں۔ وہ تو اس وقت بہہ نکلے جب میں پہلی بار بکی۔ وہ بھی صرف ایک دس روپے کے نوٹ کے عوض ـــ!

اُس لوٹ نے تب ایک۔ ان چھوٹی کلی کو مٹھوں میں مسل کے رکھ دیا تھا تب سے اب تک میں روز ہی بکی۔ پہلے دس، سال بھر کے بعد قیمت پانچ روپے تک پہونچی اور اب صرف دو روپے۔ اب تو کچھ بھی میرے پاس نہیں چہرے کا رنگ ہی چھوٹ گیا۔ جوانی ڈھل گئی۔ اپنا وجود بھی اب پہچانا نہیں جاتا آج کے بابو کو یہ دو روپے کا نوٹ دینا بھی گراں گذرا۔

میں اُس سے بہت کچھ کہنا چاہتی تھی۔ اپنی مجبوریوں کے متعلق، بیتی زندگی کے بارے میں۔ میں اُسے کیسے کہتی۔ میرے خوابوں کی تعبیر یہ دو روپے کا نوٹ نہیں۔ وہ تو کچھ اور ہی تھی۔ تابناک مستقبل، اپنا گھر اور آنگن میں کھیلتے ہوئے ننھے منّے اور وہ خیالی شہزادہ، جس کے تصوّر میں، میں دن بھر کھوئی رہتی تھی۔ اس کے چوڑے چکلے سینے پر اپنا سر رکھ کر اس کے دل کی دھڑکنیں سنتی۔ اُس کی مضبوط باہوں کی گرفت اپنے شانوں پر محسوس کرتی۔ اُن سب خوابوں کی تعبیر یہ دو روپے کا نوٹ کیسے ہو سکتا ہے۔؟

وہ سارے خواب ٹوٹ چکے ہیں۔!

وہی بابا کا گھر ہے۔ گھر کیا جھونپڑی، تنگ و تاریک قید خانہ۔ جیسے زندہ ہی دیوار میں چنوا دیا گیا ہو۔ ننھے منّوں کی جگہ دو چھوٹی بہنیں اور بوڑھی ماں۔ خیالی شہزادے کی جگہ بہت سارے درندے میرے جسم کو نوچتے ہیں۔!

میں کچھ نہ کہہ سکی۔ الفاظ ہونٹوں تک آ کر پگھلتے گئے۔!

سورج کی سنہری تھالی مغرب کی پہاڑوں میں مُنہ چھپانے ہی والی ہے۔

تم آ ؤ گی ۔ !

تم لوٹ آ ؤ گی ۔ یہ میں نہیں، میرے دِل کی ہر دھڑکن کہتی ہے، لیکن ۔۔۔ جب تم لوٹ آ ؤ گی ۔ یہاں کچھ بھی نہ ہوگا ۔ سب کچھ فنا ہو چکا ہوگا ۔ میں بھلا ان نحوست بھرے بادلوں سے کیسے نکل سکتا ہوں ۔ تم یہاں ماضی کے کھنڈر کے سوا کچھ بھی نہ پاؤ گی ۔ تم چیخ چیخ کر اپنی محبت کی بھیک مانگو گی ۔ لیکن تمہاری چیخیں صدائے بازگشت بن کر تمہارا مذاق اُڑائیں گی ۔ تم مجھے پکارو گی ۔ میں نہ ہوں گا ۔ لیکن میرے پَر تو ان کھنڈروں میں ضرور ہوں گے ۔ میری کہی ہوئی ایک ایک بات، ہتھوڑے کی ضرب بن کر تمہارے دِل پہ پڑے گی، تم روؤ گی تڑپو گی، سینے کے تلاطم تھمنے کا نام نہیں لیں گے ۔ اپنے آپ سے نفرت کرنے لگو گی، دل و دماغ خودکشی پر اُکسائیں گے ۔ لیکن کر نہ سکو گی ۔ فقط اپنی ہی لگائی ہوئی آگ میں دھیرے دھیرے بھسم ہو جاؤ گی ۔

یقین کرو یہ میری بد دُعا نہیں ۔ پیشگوئی ہے جس کی صحت پہ مجھے کوئی شک و شبہ نہیں ۔ !

رُوحی ۔ تم میری تھی، میری ہو اور رہو گی، جسموں کے ملاپ نہ سہی، تمہیں اپنی روح سونپ چکا ہوں، دل کی اتھاہ گہرائیوں میں تم ہی تو ہو ۔۔۔ !

میں جانتا ہوں ۔۔۔ وقت کے تُند و تیز تھپیڑوں نے تمہیں مجھ سے جدا کیا ۔ تم بہت دُور چلی گئی ۔ تم اُس دھوپ کی متلاشی ہو، جس سے آنکھیں چکا چوند ہو جاتی ہیں ۔ جو کسی بھی شئے کو پگھلا سکتی ہیں ۔ بھلا میری محبت کیسے بچ پاتی اس تیز دھوپ سے ۔ !

لیکن یاد رہے — کالے بادل اس دھوپ کو نگل بھی سکتے ہیں۔ تب تمہیں میری یاد آئے گی۔ لیکن میں زندگی کے اس آخری موڑ پہ پہنچ گیا ہوں گا — جہاں سے مجھے کوئی واپس نہ لا سکے گا —!

ہو سکے تو اس گھڑی ضرور ملنے آنا —!

تمہارا ———— ساجد

[نوٹ — یہ خط کسی وجہ سے پوسٹ نہ ہو سکا]

---

وہ ابھی ابھی میرے سامنے سے اٹھ کے چلا گیا۔ جاتے جاتے اس کی آنکھیں ڈبڈبائی تھیں۔ جب ہم دونوں کی نگاہیں آخری بار ملیں تو میرے دل کی دیواریں ہلنے لگی تھیں۔ میں کانپ اٹھی اور ہونٹ تھرتھرائے تھے۔

"ساجدہ معاف کرنا — ہمارا ساتھ بس یہاں تک ہی تھا۔ یہیں سے ہم نے ایک نئی منزل کی جانب قدم بڑھائے تھے اور آج اسی مقام سے الگ الگ سمتوں کو جا نکلیں گے۔"

میرے چہرے سے نظریں ہٹا کر وہ چنار کے ان نارنجی پتوں کو دیکھنے لگا جو ہوا کے تیز جھونکوں کے رحم و کرم پر تھے۔ شاید وہ اپنی زندگی کا موازنہ ان پتوں سے کرنے لگا تھا جو خزاں کو دیکھتے ہی اپنا رنگ کھو بیٹھتے ہیں اور دھیرے دھیرے جھڑنے لگتے ہیں۔

اس کے چہرے کا اتار چڑھاؤ دیکھ کر میں سہم گئی۔ خزاں کی ویرانیاں اس پہ رقصاں تھیں۔ لمحہ بھر کے لئے میرا مقصد [illegible] کی طرح پگھلنے لگا۔ آتش

میری مجبوری کو سمجھتے کیوں نہیں۔"

"مجبور اور تم ۔۔۔ ؟" وہ پاگلوں ایسے انداز میں ہنسنے لگا۔ اس کے قہقہے ہاروں کے پائیوں کے شور نے دبوچ لئے تھے۔ لہجے کی کرختگی سے میں گھبرا گئی۔ کہیں وہ اپنا دماغی توازن کھو نہ بیٹھے۔

"ہوش میں آؤ ساجد۔" میں نے اُسے جھنجھوڑا۔

"ہوش ۔۔" اس نے حرف حرف کو طول دیکر کہا۔ نارنجی پتوں پر اُس کی نگاہیں برابر جمی ہوئی تھیں۔

میں آج گھر سے یہ فیصلہ کر کے چلی تھی۔ ساجد کو صاف صاف کہہ دوں گی۔ ہم دونوں کا ملن ایک خواب ہے۔ میرے بابا کو ایک ایسے داماد کی ضرورت ہے، جو اُجالوں کا پجاری ہو، ڈگری ہولڈر ہو، فراٹے بھرتی کار کا مالک ہو، عالیشان بنگلہ پاس ہو۔ تمہاری طرح ایک کلرک نہیں، جو دن بھر دفتر کی فائلوں کی گرد جھاڑتا، چہرے پر پریشانیوں کا بوجھ لادے، تھکے قدموں گھر لوٹتا ہے۔

میں کچھ بھی نہ کہہ پائی ۔۔۔

"ساجد ۔۔۔ پلیز مجھے سمجھو ۔۔۔" میں روہانسی ہوئی۔

"کیا سمجھوں ۔۔۔" اُس نے میری طرف دیکھا۔ آنکھیں آنسوؤں کے ساگر میں ڈوبنے جا رہی تھیں ۔۔۔ "روحی ۔۔۔ تم جاؤ، تم کو نئی دنیا مبارک، مجھے جاتی بہار کا نظارہ کرنے دو۔ یہ بہاریں دوبارہ لوٹ کے نہیں آئیں گی۔ میں اپنی بادوں کے سہارے جیوں گا۔" اُس کی آواز میں لرزش کے باوجود بھی ایک ٹھوس فیصلہ تھا۔

میری مشکل آسان ہو گئی۔ میں آزاد تھی۔ ایک سال کی گھٹن سے چھٹکارا مل گیا۔ لیکن دل کے کسی نامعلوم گوشے سے اب بھی آواز آرہی تھی۔ روحی تم نے اچھا نہیں کیا۔ زخمی دل کو اس طرح روندنا وہ بھی چھوٹی شان کے لئے تم نے تو ساتھ نبھانے کا وعدہ کیا تھا۔ سارے رشتے ٹھکرا کر اسے اپنانے کی قسم کھائی تھی۔ وہ شام تم کیسے بھول گئی جب تم نے اپنا اٹل فیصلہ سنایا تھا۔ کیا فیصلے یوں ہی بدلا کرتے ہیں۔ سوچو، کیا تمہارے چلے جانے کے بعد وہ بچ سکیگا۔

جب میں خیالوں کے ساگر سے نکل کر کنارے پہونچی تو وہ لٹے ہوئے مسافر کی طرح جا رہا تھا۔ باغ کے گیٹ کے قریب پہونچ کر اس نے مڑ کے میری طرف دیکھا اور پھر تیز تیز قدموں سے وہ میری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

میں نے اطمینان کا گہرا سانس لیا۔ اور رنگین فضاؤں میں کھو کر مستقبل کو تلاش کرنے لگی۔ ایک ایسے مستقبل کو جس میں تابناکی ہو، اندھیروں کا شائبہ تک نہ ہو۔!

---

تین سال بعد۔

سنگل ٹیچر سکول کی ننھی کلیاں اپنی ٹیچرس مس روحی کے ساتھ بادام کے شگوفے دیکھنے بادام واری گئیں۔ بادام کے شگوفوں کی طرح ان ننھی کلیوں کے چہروں پر تازگی تھی۔ قدرت کے بخشے مختلف رنگ تھے۔!

مس روحی ان ننھی کلیوں کو ان خوشرنگ شگوفوں کو مسلنے سے روک رہی تھی۔ وہ انہیں سمجھا رہی تھی۔ انہیں مسلنا گناہ ہے، خدا ناراض ہو جاتا ہے۔ اور وہ معصومیت سے اپنی ٹیچرس کا منہ تکنے لگیں۔

بھینچی مٹھیاں کھل گئیں۔ کچلے، مسلے شگوفے مخملی گھاس پر بکھر گئے ـــ

روحی حسرت بھری نگاہوں سے ان کچلے مسلے شگوفوں کو دیکھنے لگی۔

وہ لڑکیوں کے جھرمٹ سے دور نکل آئی اور قدم پاگل خانے کی آہنی

آہنی سلاخوں والی کھڑکیوں کے قریب جا رُکے۔ کچھ سنجیدہ چہرے ـــ

کچھ دونی صورتیں اور کچھ کھوکھلی مسکراہٹیں ـــ!

وہ قدم آگے بڑھاتی گئی۔ لیکن آخری کھڑکی کے پاس اس کے قدم

جم گئے۔ اگر اس نے آہنی سلاخوں کا سہارا نہ لیا ہوتا تو دھڑام سے گر گئی ہوتی

دو انگارے اس کی نگاہوں میں پیوست ہو گئے۔ اُسے ایسا لگا جیسے اُن

نگاہوں کی تیز آنچ سے اس کا وجود پگھل رہا ہو۔ اس نے اُسے آواز دینا

چاہی تھی آواز حلق سے باہر نہ آسکی۔

وہ پاگل اُسے گھور گھور کے دیکھنے لگا۔ جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو

وہ قہقہے لگاتا ہوا سلاخوں کے بالکل قریب آیا۔

وہ بالکل نہ گھبرائی اور نہ نگاہیں جھکا لیں۔

پاگل عجیب نظروں سے اس کے سراپا کا جائزہ لینے لگا اور سر کو جھٹکا دیکر

ایک زوردار قہقہہ لگا کر کہا۔ "تم بھی میری روحی کی طرح مجبور ہو گی۔ کیوں ہو نا"

روحی کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب بہنے کی راہ تلاش کرنے لگا۔

کانپتے ہونٹوں سے صرف ایک اُدھورا لفظ ادا ہو سکا ــــ "سا . . . . . "

اور وہ لڑکھڑاتے قدموں سے بادام کے شگوفے کچلتے واپس لوٹی ـــ!

جنوری سنہ ۱۹۷۳ء

# ساحل کے تھپیڑے

آٹھ برس ـــ

اتنی لمبی مسافت طے کر چکنے میں اُن کھنڈروں میں لوٹ آئی ہوں جن کی شکستہ دیواریں دمے کے مریض کی طرح ہلتی ہیں۔ اب یہاں بچا ہی کیا ہے، مایوسیاں اور تلخیاں میرا اوڑھنا بچھونا ہیں۔ ایک پرچھائیں ذہن کے نرم گداز پردے پر مستحکم ہے۔ کالی پرچھائیں جس کا ہر فعل کالا رہا۔ دنیا کی نظروں میں وہ فرشتہ سیرت سہی۔ لیکن میری نظروں نے اس کے چہرے کے وہ سارے پردے نوچ لئے ہیں۔ ایک مکروہ صورت ہے جس پر انسانیت کا پُر فریب خول چڑھا ہے۔ زندگی کی اتنی لمبی مسافت طے کر کے واپس اُسی موڑ پر آنا جہاں سے میں چلی تھی۔ کتنا کٹھن راستہ تھا، کتنی گہری گھاٹیاں تھیں جنہیں پاٹنا مشکل تھا۔ میں اپنے ارمانوں کو دفنا کر لوٹی ہوں، آنسوؤں کے ساتھ۔ اب یہی آنسو میرے ابدی ساتھی ہیں۔ مجھے اب اِن ہی کھنڈروں میں زندگی کے باقی ماندہ دن گزارنے ہیں۔۔۔!

{ شاہدہ کی ڈائری سے اقتباس }

پریم بستی
۲۲ر اکتوبر۔

محترمہ آداب!

تم نے میرے دل کی دنیا میں قدم کیا رکھا ہر طرف شوخ رنگ پھول کھل اُٹھے۔ معاف کرنا، "آپ" سے "تم" پر اُتر آیا۔ تمہیں یہ پوچھنے کا حق ہے۔ میں نے لفظ "تم" کیوں استعمال کیا۔ تو سُن لو۔ جب دو دلوں میں ایک سے جذبے جنم لیں ذہن یکساں روش اپنائیں۔ تو تکلف کی دیواریں مسمار ہوا کرتی ہیں۔ میں نے یہ دیوار جان بُوجھ کر نہیں گرائی۔ بلکہ میرا دل و دماغ اب ان دیواروں کو زیادہ دیر برداشت نہیں کر سکتا۔ میں سمجھتا ہوں اب تکلف ہمارے درمیان ایک بے معنی لفظ ہے۔ یقیناً تمہارے خیالات بھی ایسے ہی ہوں گے۔!

اُوشا نے میرے ساتھ بہت سی غلط باتیں منسوب کی ہیں جن سے تمہارے جذبات مجروح ہوئے ہوں گے۔ لیکن تم تو سمجھدار تھی، جانتی تھی کہ اُوشا کس قماش کی لڑکی ہے۔ میں نے اُسے بہن مانا تھا۔ لیکن اُس نے اس مقدس رشتے کا کوئی پاس نہ کیا۔ وہ دراصل اس رشتے کے لائق نہ تھی۔ تمہیں یاد ہوگا اُس نے کیسے میرے عزیز دوست کی زندگی اذیت ناک بنا ڈالی پہلے جھوٹی محبت کے جال میں پھانسا اور پھر اُسے تڑپتا چھوڑ کر اپنی الگ دنیا بسالی۔ تم بھی اُوشا کے کہنے میں آ گئی۔

مختصر یہ۔ مجھے اپنے کریکٹر پر ناز تھا، ہے اور رہے گا۔ ایک اُوشا چھوڑ کر اگر لاکھ اُوشائیں مجھے ذلیل کرنے پر تُل جائیں تب بھی کوئی غم نہیں۔ اُوشا پر

ہی کیا موقوف یہاں تو ہر لڑکی ایسی ہے۔!

لو اب صفائی پیش کرتا ہوں۔ میری شادی ہوئی ہے نہ میں دو بچوں کا باپ ہوں۔ تم ہنس رہی ہو بچوں والی بات پر ہے نا یہی بات سبب ؟ براہ کرم ان لغو باتوں میں نہ اُلجھو۔ بے وجہ کی اُداسی کو من میں نہ لاؤ۔

رہی بات، میں نے آج تک شادی کیوں نہ کی یہ مجھے خود معلوم نہیں، تمہیں کیا بتاؤں۔ لیکن اب حالات بدل گئے ہیں۔ میں نے شادی کے متعلق سنجیدگی سے سوچنا شروع کر دیا۔ تم یہی جاننا چاہتی ہو نا کہ میری دلہن کون ہوگی۔ سنو، تمہارے سوا کون میری دُلہن بنے گی۔ تیار رہنا میں کسی دن تمہیں لینے آرہا ہوں۔!

کتنی سہانی گھڑی ہوگی۔ جب تم میرے سامنے ہوگی۔ میں تمہارا گھونگھٹ اپنے ہاتھوں سے اُٹھاؤں گا۔ تم شرماؤ گی۔

لو تم تو سچ مچ شرمانے لگی۔ ابھی میں آیا نہیں اور تمہارے دل کی دھڑکنیں تیز ہوگئیں۔

(جواب کا منتظر —— تابش)

---

آشیانہ

۲۸ اکتوبر۔ محترم تسلیم!

آپ کا خط ملا۔ مانا اُوشا نے جو کچھ بھی آپ کے بارے میں کہا، سب غلط ہے چلو یہ بھی مانا اُس نے بہن بھائی کے رشتے کو یکسر بھلا دیا۔ لیکن آپ سے ایسی اُمید نہ تھی۔ آپ نے حد کر دی ہر لڑکی کو اُوشا سمجھا۔!

دیکھئے محترم، یہ آپ کے شایانِ شان نہیں۔ ماں کی ممتا، بہن کی بے لوث محبت اور بیوی کی وفا شعاری اس صنف کے تین روپ ہیں۔ آپ یہ کیسے بھول گئے۔ مجھے آپ کی زبان پر اعتبار ہے۔ اب آپ خوش ہیں نا ــ ؟

(خلوص والیہ ــ شاہدہ)

پریم بستی

۵ نومبر۔۔۔

شاہدہ میری زندگی!

میرے خط سے تم ناراض ہو گئیں، معافی کا خواستگار ہوں۔ میں نے تو اپنی صفائی پیش کی تھی۔ بخدا میرے دل میں کبھی یہ خیال نہ تھا کہ لڑکیوں پر کیچڑ اچھالوں۔ مجھے بھی کسی ماں نے جنم دیا ہے۔ وہ بھی تو کبھی لڑکی رہی ہوگی۔ کیا میں اس رشتے کو بھول جاؤں۔

شاہدہ یہ دنیا ہے نا۔ یہاں ہر ایک کسی نہ کسی پر عادی ہے جیسے سورج کے بغیر چاند کی کوئی وقعت نہیں۔ یہ تو سورج ہے جو اسے روشنی بخشتا ہے۔ ورنہ شعراء نے کبھی اس کی تابناکی پر اپنے دیوان نہ بھرے ہوتے۔ زندگی چند سانسوں کا نام ہے۔ سانس رُک گیا تو باقی کچھ بھی نہیں رہتا۔ کیوں نہ اُس وقت تک ایک دوسرے میں کھو جائیں۔ جب تک سانس باقی ہے!

تمہیں مجھ پر اعتماد ہے۔ اِس کے سوا مجھے اور کیا چاہیئے۔

تمہارا ــ نالش

آشیانہ
۱۰ نومبر...

کس نام سے پکاروں آپ سوچ میں ہوں -!

قلمی نوک جھونک ہمیں کہیں دور نہ کردے - اس لئے ایک دوسرے پر الزام تراشیاں کرنا چھوڑ دیں - چلیئے میں نے مانا - آپ نے جو کچھ لکھا، درست ہے -- !

میں اقرار کرتی ہوں کہ کوئی انجانی کشش مجھے آپ کے بارے میں سوچنے پر مجبور کرتی ہے - شاید یہ محبت ہی ہے جو مجھے جھکا رہی ہے ورنہ میں جھکنے والی نہیں -- !

آپ کی ---- شاہدہ

---

پریم بستی
۲۵ نومبر...

شاہدہ میری زندگی!

تم کسی بھی نام سے مجھے پکار سکتی ہو، جو بھی تمہارے من کو بھائے! تمہیں مجھ سے محبت ہے - بس یہی میرے لئے کافی ہے - اندھے کو روشنی مل جائے تو وہ خدا سے اور کیا مانگے گا!

میرا یہ وعدہ ہے کہ تمہارے جذبات کبھی مجروح نہ کروں گا - آج کل کاروباری معاملے میں اُلجھا ہوا ہوں - شادی کے لئے اگر ایک ڈیڑھ سالی

انتظار بھی کرنا پڑا تو محبت میں یہ کوئی بڑی بات نہ ہو گی سمجھے یقین ہے
میری مجبوریوں کو نگاہ میں رکھتے ہوئے تم انتظار کرو گی !
بولو کیا اتنی قربانی بھی نہیں دے سکتی ہو ـــ !

حرف تمہارا ــــ تابش

---

آشیانہ
۲ ستمبر . . .

تابش !

دو سال گذر گئے ـــ

تم نے تو ایک ڈیڑھ سال انتظار کرنے کو کہا تھا۔ ان دو سالوں میں تمہارے خطوں کے جواب برابر دیتی رہی ـــ میں اب تھک گئی ہوں، اب انتظار کی مجھ میں سکت نہیں۔ جلدی آجاؤ ـــ کہیں ایسا نہ ہو، انتظار کرتے کرتے میری آنکھیں پتھرا جائیں۔ دیکھو اب بہت آزما لیا ـــ آجاؤ، شاہدہ کا ہر سانس تمہیں پکارتا ہے ـــ !

منتظر ــــ شاہدہ

---

انتظار ـــ

میں نے اپنی زندگی کے لمحے اس انتظار میں کاٹے۔ تم آؤ گے۔ لیکن تم کیسے آتے۔ تمہاری سیاہ کاریوں پر سے پردہ اٹھ چکا تھا۔ اوشا کی کہی

ہوئی باتیں سچے ثابت ہو گئیں۔ تم دو بچوں کے باپ نکلے۔

ایک خواب ہی تو تھا جو آنکھ کھلتے ہی ٹوٹ گیا۔ خواب تو بھلانے کے لئے دیکھے جاتے ہیں۔ لیکن کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں، جن کے نقوش ذہن کے کینوس پر تاعمر رہتے ہیں۔!

اب میں ناکارہ ہوں ــ ناکاروں کو بھلا اس دنیا میں کون پوچھتا ہے۔ کوئی بھی دل ان کی یاد میں نہیں دھڑکتا ــ اب اس ملبے کے ڈھیر میں دبی چنگاریوں کو کوئی ہوا نہیں دے سکتا۔ میں انگ انگ محبت کے بھڑکتے شعلوں کے نذر کر کے آئی ہوں.....

{شاہدہ کی ڈائری سے اقتباس}

نومبر ۱۹۷۲ء

# پیوند!!

عارفہ کی اخروٹی رنگت والی زلفیں مجھے بالکل نہ بھائیں۔ نعیمہ کو اس لئے ٹھکرایا۔ اُس کی زلفیں شانوں تک ہی تھیں۔!

کالی اور لمبی زلفیں میری کمزوری رہی ہے۔

درجن بھر لڑکیوں میں سے آخر میمونہ کا انتخاب ہوا۔ سیاہ زلفوں کی لہراتی زنجیر مجھے کس کے باندھنے میں کامیاب ہو گئی۔! شادی ہو گئی!

پہلی رات میں اسکی زلفوں سے کھیلتا رہا۔ "میمونہ" تمہاری ان لمبی زلفوں نے آخر مجھے باندھ ہی لیا۔" میں نے کہا۔

وہ بولی۔ یہ تو کچھ بھی نہیں ہیں۔ ان سے بھی لمبی اور کالی زلفیں ڈھونڈنے سے ملیں گی۔"

جانے میری آنکھ کب لگی اور جب کھلی تو اپنے آپ کو زلفوں کے جال میں بُری طرح اُلجھا پایا۔ لیکن اُس وقت میری حیرانگی کی کوئی حد نہ رہی جب میں نے بند پلکوں ہی اسی کے جسم پر ہاتھ پھیرنا چاہا۔ وہاں تو کوئی نہ تھا۔ صرف زلفیں۔ ہاں، باتھ رُوم سے میمونہ کے گنگنانے کی آواز آرہی تھی۔!!!

م ۔ ۴، ۴ صدیق!!

# کرب کی صلیب

رات پگھل رہی ہے اور میں تمہاری تصویر پر نظریں ٹکائے پگھل رہی ہوں۔ اب یہ آنسو ہی تو رہ گئے ہیں، جنہیں بہا کر میں اپنا جی ہلکان کر لیتی ہوں۔ میں آج تم سے بہت سی باتیں کرنا چاہتی ہوں۔ تب کی اور اب کی، کتنا فرق ہے "تب" اور "اب" میں۔ "تب" کتنا رنگین تھا اور "اب" کتنا کربناک۔ تب میری سوچوں کا ڈھنگ ایسا نہ تھا۔ گمان بھی نہ تھا کہ کبھی ایسی ساعت آئے گی جب سوچوں میں کربناکی گھل جائے گی۔!

تمہاری تصویر، ساکت دیواریں، کربناک خاموشی اور یہ کالی رات۔ میرا ماضی تو اُن بگاڑ کے رکھ دیں گے۔

تم سامنے ہو۔ کیا ہوا اگر تم بول نہیں سکتے۔ یہ کربناکی دیکھ تو سکتے ہو، محسوس تو کر سکتے ہو۔ میرے دل کی بے ربط دھڑکنیں گن تو سکتے ہو۔!

آج میں قفس میں ہوں اور تم آزاد۔ میں بھی تو کھلی فضاؤں میں سانس لینے کی متمنی ہوں، لیکن ان آہنی سلاخوں کو کیسے توڑ دوں، جن سے سر ٹکرا ٹکرا کر

لہولہان ہونا میرا مقدر ہے۔ صیاد کی نظریں بچا کر بھلا پنجرہ توڑنا میرے بس کی بات نہیں اب اڑنا نہیں، پھڑپھڑانا میری قسمت میں لکھا ہے۔ اڑنے کی سعی مجھے رسوا کردے گی سماج انگلیاں اٹھائے گا۔ کیا تم یہی چاہتے ہو سیمیرکا بدنامی ہو۔ تمہارے خلوص کو دنیا شک کی نظروں سے دیکھے۔

نہیں ــ مجھے تڑپنے دو۔ تمہیں تڑپا کر میں نے یہ کرب حاصل کیا ہے شاید یہ تمہاری آہوں کا اثر ہے جو مجھے کسی کروٹ چین نصیب نہیں۔ میں بغاوت نہ کرسکی۔ چپ چاپ اپنی ناؤ کو لہروں کے سپرد کردیا۔ ہاں، وہی تو خطا ہوئی اور اب سزا بن گئی۔ مجھے اب اکیلے ہی اسے بھگتنے دو۔ اس سزا میں تم کیوں میرے شریک بنتے ہو۔ قصور میرا تھا۔ تم کیوں ناحق سزا بھگتو گے۔

تمہیں آج بھی اپنی شمی سے والہانہ محبت ہے۔ یہ میں نہیں، میرے دل کی ہر دھڑکن کہتی ہے۔ وہ دل ــ جسے تم نے محبت ایسے لطیف درد سے آشنا کرایا تھا۔ مجھے یقین ہے ــ میں اگر آج بھی قفس توڑ کر تمہارے پاس چلی آؤں، تم مجھے اپنانے سے دریغ نہیں کروگے لیکن نہیں ــ ایسا میں کیوں سوچتی ہوں۔ کتنی زندگیاں تلخ ہوں گی۔ یہ خیال آتے ہی کانپ اٹھتی ہوں اور قدم روک لیتی ہوں۔

میرے محبوب ــ مجھے تمہارے دکھوں کا بھی احساس ہے۔ تم نے مجھ سے بچھڑ کر کیسے صبر کیا ہوگا۔ تم پر اس وقت کیا بیتی ہوگی جب تم سدا کے لئے اپنی شمی سے جدا ہوئے۔

مجھے زندہ دیواروں میں چنوا دیا گیا ــ چاردیواری سے باہر جانے پر

پابندی لگی۔ تمہاری تسمی کو اس لئے قید کردیا گیا کہ وہ تمہاری محبت کی اسیر تھی!

لیکن کیا کبھی تمہارا دل اپنی تسمی کے لئے نہیں مچلا۔ مجھ سے ملنے کی تڑپ کیا دم توڑ چکی تھی۔ میں نے تو چار سال کی جدائی رو رو کے کاٹی۔ تمہاری تسمی نے تمہیں پل بھر بھی نہیں بھلا دیا۔ لیکن تم — تم نے کبھی خبر بھی نہ لی —!

وہ اذیت ناک گھڑی میں کیسے بھول سکتی ہوں۔ جب کھلی فضاؤں میں سانس لینے پر پابندی لگی۔ اُس روز میں نے اپنی مجبوریوں کو کورے کاغذ پر اُتار لیا تھا۔ لیکن وہ خط تم تک پہونچنے سے پہلے گھر والوں کی نظروں میں آ گیا۔ ہماری محبت انہیں ایک آنکھ نہ بھائی۔! شک تو انہیں پہلے ہی تھا لیکن خط نے اسے یقین میں بدل دیا۔ بس اُسی روز سے مجھے زبان جانور کی طرح بیچنے کی تیاریاں شروع ہوئیں — اور آخر ایک منحوس گھڑی سماج کی کُند چھری میرے ارمانوں پر پھیر دی گئی۔ میں اس بازار میں بِکی جہاں آج تک ہزاروں لاکھوں شمیاں بِکی ہیں —!

مجھے ایک غیر مرد کے سُپرد کر دیا گیا۔ لیکن اُس وقت بھی تم ہی تو میری نگاہوں کے سامنے تھے۔ تمہارے سوا میں دنیا کے کسی مرد کو جانتی تھی نہ کبھی جاننے کی ضرورت محسوس کی تھی۔ مجھے ایک ایسے آدمی کے پلے باندھا گیا جس کے متعلق میں نے کبھی بھولے سے سوچا بھی نہ تھا۔

ہے نا، اچھا دستور یہ اپنے سماج کا —!

تم تو کہا کرتے تھے میں اپنے قلم سے سماج کے فرسودہ رواجوں کی دھجیاں اُڑا کے رکھ دوں گا۔ تم کچھ نہ کر سکے۔ ہاں اپنی شمی کو سماج کے اُن

ہی رواجوں کی صلیب پر چڑھا دیا۔!

آج میں اسی صلیب پر لٹک رہی ہوں، زمین و آسمان کے بیچ — زمین پہ پاؤں ٹھہرا سکتی ہوں نہ آسمان کی وسعتوں میں منزل ہے۔ یوں ہی میری زندگی فنا ہو گی —!

اُف درد کی ٹیسیں مجھے ڈالے ہی دم لیں گی۔ تم بولتے کیوں نہیں کچھ کہو یا دل لو۔ تمہی تم بے وفا ہو۔ الگ دنیا بسا کے کیوں میری زندگی برباد کرنے پہ تُلی ہو —

میں جواب میں کہوں گی — تم اب بھی میرے دل کی دنیا میں بستے ہو۔ کیا ہوا اگر میرے جسم پر کسی اور کی حکومت ہے لیکن دل تو تمہارے ہی حکم کے تابع ہے۔ آزما کے دیکھ لو، اسے بھی سینہ چیر کر تمہارے نذر کر دوں گی۔ یہ دل اپنی روش نہیں بدلتا —!

کوئی بھلا ان چار سال پہلے کی ساعتوں کو ہمیں لوٹا دے۔ وہ قرب وہ ملاقاتیں اور وہ میٹھی میٹھی باتیں — سبھی کچھ تو اب ایک خواب لگتا ہے، ایسا خواب جس کی کڑیاں مشکل سے ملتی ہیں —!

یہ کالی رات ڈھل تو جائے گی۔ ہر سو اجالا پھیل جائے گا۔ لیکن میرے لئے وہ اجالا، اجالا نہیں — میں اسی کالی رات کے ساتھ ختم ہوتا چاہتی ہوں۔ بہت دیکھ لیا جی کے۔ اب موت ہی میری زندگی ہے۔ کہاں ہو تم!

تم بولتے کیوں نہیں — کیا تم نے قلم توڑ دیا ہے —؟

اُٹھاؤ قلم، اپنی شمی کو نہ سہی اور بھی تو کئی شمیاں ہیں۔ انہیں

گھٹ گھٹ کے مرنے نہ دو۔ انہیں بچاؤ۔ تم قلم سے بہت کچھ کر سکتے ہو انہیں رواجوں کی صلیب پر چڑھنے سے روک سکتے ہو۔!

الوداع ساجد۔

تم خوش رہو۔

سدا مسکراہٹیں بکھیرتے رہو۔

یہی میری دعا ہے۔ ہاں تمہارے دل کی صدا۔ !!!

اگست ۱۹۷۲ء

م۔م صدیق اور رفیق تبسم ایم۔اے

کی

تخلیقات کا دوسرا مجموعہ

"جب پرچھائیں بھاگی!"

# تصویر کے زخم

پہاڑوں کے پانیوں کا شور اب بھی میرے کانوں میں ہے پتھروں کے سینے چھلنی کرنے والا صاف شفاف پانی اور اس میں جھلملاتی ایک تصویر جس کی آنکھوں میں ڈر ایسی گہرائی ہے، اب بھی میری نگاہوں کے سامنے ہے

میں اپنے بیڈ پر ہوں — ہر سو سکوت چھایا ہوا ہے۔ میں کھڑکی سے باہر جھانکتی ہوں۔ لگتا ہے رات ٹھہر گئی ہے، ڈھلنے کا نام نہیں لے رہی ہے۔ میں صرف اپنے دل کی بے ربط دھڑکنیں گن رہی ہوں۔ مجھے بخوبی احساس ہے۔ آج یہ ایسے کیوں دھڑک رہا ہے، اس نے ربط کا دامن کیوں چھوڑا

مجھے اس تکلیف دہ سناٹے اور تاریکی سے شدید نفرت ہے۔ میں ہر طرف شور چاہتی ہوں۔ اُجالے کی متمنی ہوں — پہاڑوں کی وہ مچلتی ندی اور اس پر پھسلتی رُوپہلی دُھوپ، جس کا پانی ہنستے گاتے موت کے گلے ملتا ہے۔!

اسی کا نام تو زندگی ہے، اُس زندگی میں کیا مزا، جو سسک سسک کر دم توڑ دے۔ جو سُست رَوی سے منزل تک جا پہنچے۔ اسی لئے

مجھے جہلم کے سکون، ڈل کے ٹھہراؤ اور ولر کی گہرائیوں سے نفرت ہے جن کی سطحیں پُرسکون ہیں مگر سینوں میں تلاطم۔!

مجھے ایسے چہروں سے نفرت رہی ہے جو سنجیدہ ہوں۔ لیکن جانے کیوں وہ تصویر مجھے ورغلا رہی ہے۔ مجھے اپنی روش چھوڑنے پر اُکسا رہی ہے۔ اُف! کس قدر سنجیدہ ہے، پھیکی مسکراہٹ۔! جیسے زمانہ بھر کے دکھوں کو وُہ گھول کے پی چکے ہیں۔!

---

"آپ کوئی ساتھی کیوں نہیں چُن لیتے۔" میں اُن سے مخاطب ہوں۔

وہ خلاؤں میں گھور رہے ہیں۔ پھر چونک کر میری نگاہوں میں اُتر کر ایک گہرا سانس چھوڑتے ہیں۔

"میں اور ساتھی..." وہ لفظ چبا چبا کر جملہ اُدھورا چھوڑتے ہیں اور دوبارہ خلاؤں میں کچھ تلاش کرنے لگے ہیں۔

"کیوں۔ کیا اتنا بلند تخیل ہے جو آج تک کوئی چہرہ کا من کو نہ بھایا۔؟" میں انہیں ماضی کی گہری گھاٹی سے نکالنے کی سعی کرتی ہوں۔

"نہیں۔ ایسی بات ۔۔" وہ نظریں نیچی کر کے مخملی گھاس سے کھیلنے لگتے ہیں۔" میرا کوئی تخیل نہیں۔ عام انسان ہوں۔ تخیل تو فن کاروں کے ہوا کرتے ہیں۔ میں حُسن کا شیدائی نہیں، دِل کا متلاشی ہوں۔ ایک ایسے دِل کا جس میں خلوص ہو۔ کوئی سراپا وفا ہو بھلے ہی بدصورت ہو۔!"

"لگتا ہے، کسی خوبصورت چہرے سے دھوکہ کھا چکے ہو۔" میں سرگوشیانہ

ندازمیں پوچھتی ہوں۔

وہ میرے چہرے پر اپنی خالی نظریں گاڑ دیتے ہیں اور پھیکی مسکراہٹ لبوں

پر لاکے شائد ماضی کی تاریکیوں میں ہاتھ پاؤں مارنے لگے ہیں۔

"کتابی چہروں کے دھوکے بھی کتابی ہوا کرتے ہیں۔ جنہیں انسان دھوکہ

تصور نہیں کرتا لیکن کھاتا ضرور ہے۔ مجھے بھی بس اپنی قسمت کے ماروں میں

شمار کر لو۔ دیسے میں ماضی کے دلدل سے نکل بھاگا ہوں۔ آپ کیوں مجھے ان

ہی تاریکیوں کی طرف دھکیل رہی ہیں۔ ماضی اور مستقبل پر سوچنا چھوڑ کر

میں نے حال پر قناعت کرنا سیکھا ہے۔"

اس کی آنکھیں بھیگ چکی ہیں لیکن آنسو چھلک نہیں پڑے ہیں۔

"معاف کیجئے۔ آپ کا موڈ خراب کر دیا۔" میں رُندھی آواز میں کہتی ہوں

"نہیں۔ ایسا نہیں۔" وہ ماضی کی تلخیوں کو اپنے چہرے پر سے

کھرچنے لگے ہیں اور پھر پل میں مجھے ان کا چہرہ ہشاش بشاش لگتا ہے۔ جیسے

انہوں نے زردوں کے ٹھنڈے سے اسے دھو ڈالا ہو۔!

"کیا آپ کو پھولوں سے لگاؤ ہے۔؟" میں موضوع بدلتی ہوں۔

"کیوں۔؟" وہ سراپا سوال بنتے ہیں۔

اس لئے کہ مجھے کانٹوں سے محبت ہے اور پھولوں سے بیر۔!" میں

شہادت کی انگلی سے اُس پھول کی جانب اشارہ کرتی ہوں، جو تھوڑے

فاصلے پر جنگلی گھاس میں تنہا کھِل اُٹھا ہے۔

"ایسے پھول تو مجھے بھی پسند نہیں۔ جن کے کھلنے کا کوئی مقصد نہ ہو۔ جن

پربالی کی نظر نہ جاتی ہو — !"

وہ اُس شوخ رنگ پھول کو توڑنے کے لئے آگے بڑھتے ہیں۔

میری خاموش نگاہیں انہیں اُس پھول کو توڑنے سے روک رہی ہیں اُن کا چہرہ اچانک تاریک پڑ جاتا ہے۔ مجھے محسوس ہوتا ہے جیسے کسی نے مجھ سے پہلے بھی انہیں ایسے ہی کسی پھول کو توڑنے سے روکا ہوگا۔

وہ شاید مجھ سے کچھ کہنا چاہتے ہیں، پر ذہنی کشمکش انہیں ندی کے تیز بہاؤ کے ساتھ کہیں دور لے جاتی ہے — !

میں دیکھ رہی ہوں — ایک سیلاب ہے، جو اس کی آنکھوں میں رُکا پڑا ہے لیکن اُسے بہا کر وہ ماحول کو بوجھل بنانا نہیں چاہتے۔ میں اس کے چہرے کے ہر شکن کو پڑھ چکی ہوں۔ تشنگی، ویرانیاں اور مایوسیاں — بس یہی کچھ تو ان میں پوشیدہ ہیں — !

آفتاب چھپنے کو تیار ہے۔ ہماری راہیں جدا ہونے میں چند لمحوں کی دیر ہے۔ وہ شاید نہیں چاہتے ہم جدا ہوں — میں بھی یہی چاہتی ہوں۔ لیکن ہمیں بچھڑنا دوبارہ ملنے کے لئے۔ میں اُن سے چلنے کی اجازت طلب کرتی ہوں۔ وہ نگاہوں سے جواب دیتے ہیں۔

"رُک جاؤ۔ میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں — !"

میں نگاہیں نیچی کر کے قدم بڑھاتی ہوں۔ وہ دل پر جبر کر کے مجھے وداع کرتے ہیں۔ اُن کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے ہیں اور میں اپنے سینے میں ایک لطیف چبھن لئے اُن کی نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہوں — !

انداز میں پوچھتی ہوں۔

وہ میرے چہرے پر اپنی خالی نظریں گاڑ دیتے ہیں اور پھیکی مسکراہٹ لبوں پر لاکے شاید ماضی کی تاریکیوں میں ہاتھ پاؤں مارنے لگتے ہیں۔

"کتابی چہروں کے دھوکے بھی کتابی ہوا کرتے ہیں۔ جنہیں انسان دھوکہ تصور نہیں کرتا لیکن کھاتا ضرور ہے۔ مجھے بھی بس انہی قسمت کے ماروں میں شمار کرلو۔ ویسے میں ماضی کے دلدل سے نکل بھاگا ہوں۔ آپ کیوں مجھے ان ہی تاریکیوں کی طرف دھکیل رہی ہیں۔ ماضی اور مستقبل پر سوچنا چھوڑ کر میں نے حال پر قناعت کرنا سیکھا ہے۔"

اس کی آنکھیں بھیگ چکی ہیں لیکن آنسو چھلک نہیں پڑے ہیں۔

"معاف کیجئے۔ آپ کا موڈ خراب کردیا۔" میں ندھی آواز میں کہتی ہوں

"نہیں۔ ایسا نہیں۔" وہ ماضی کی تلخیوں کو اپنے چہرے پر سے کھرچنے لگے ہیں اور پھر پل میں مجھے ان کا چہرہ ہشاش بشاش لگتا ہے۔ جیسے انہوں نے آنسوؤں کے ٹھنڈے سے اسے دھو ڈالا ہو۔!

"کیا آپ کو پھولوں سے لگاؤ ہے۔؟" میں موضوع بدلتی ہوں۔

"کیوں۔؟" وہ سراپا سوال بنتے ہیں۔

اس لئے کہ مجھے کانٹوں سے محبت ہے اور پھولوں سے بیر۔!" میں شہادت کی انگلی سے اُس پھول کی جانب اشارہ کرتی ہوں، جو تھوڑے فاصلے پر مخملی گھاس میں تنہا کھِل اُٹھا ہے۔

"ایسے پھول تو مجھے بھی پسند نہیں۔ جن کے کھِلنے کا کوئی مقصد نہ ہو۔ جن

پرمالی کی نظر نہ جاتی ہو — !"

وہ اُس شوخ رنگ پھول کو توڑنے کے لئے آگے بڑھتے ہیں۔
میری خاموش نگاہیں انہیں اُس پھول کو توڑنے سے روک رہی ہیں
اُن کا چہرہ اچانک تاریک پڑ جاتا ہے۔ مجھے محسوس ہوتا ہے جیسے کسی نے
مجھ سے پہلے بھی انہیں ایسے ہی کسی پھول کو توڑنے سے روکا ہوگا۔
وہ شاید مجھ سے کچھ کہنا چاہتے ہیں، پر ذہنی کشمکش انہیں ندی کے تیز
بہاؤ کے ساتھ کہیں دُور لے جاتی ہے — !

میں دیکھ رہی ہوں — ایک سیلاب ہے، جو اس کی آنکھوں میں اُمڈ آیا
پڑا ہے لیکن اُسے بہا کر وہ ماحول کو بوجھل بنانا نہیں چاہتے۔ میں اس کے
چہرے کے ہر شکن کو پڑھ چکی ہوں۔ تشنگی، ویرانیاں اور مایوسیاں —
بس یہی کچھ تو ان میں پوشیدہ ہیں — !

آفتاب چھپنے کو تیار ہے۔ ہماری راہیں جدا ہونے میں چند لمحوں کی
دیر ہے۔ وہ شاید نہیں چاہتے ہم جُدا ہوں — میں بھی یہی چاہتی ہوں۔
لیکن ہمیں بچھڑنا دوبارہ ملنے کے لئے۔ میں اُن سے چلنے کی اجازت طلب
کرتی ہوں۔ وہ نگاہوں سے جواب دیتے ہیں۔

"رُک جاؤ۔ میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں — !"

میں نگاہیں نیچی کر کے قدم بڑھاتی ہوں۔ وہ دل پر جبر کر کے مجھے
وداع کرتے ہیں۔ اُن کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے ہیں اور میں اپنے سینے
میں ایک لطیف چبھن لئے اُن کی نظروں سے اوجھل ہو جاتی ہوں — !

رات سُرعت سے سرکنے لگی ہے۔ شاید اسے بھی اُجالے میں مدغم ہونے کی فکر ہے۔ وہ بھی میرے آئیڈیل میں مدغم ہوں گے۔ یہ سوچ کر میں اپنے بوجھل وجود کو ہلکا پھلکا محسوس کرتی ہوں۔ زندگی کے نازک موڑ کو پار کرنا اب میرے لئے آسان ہے۔ میں نے اب ساری گتھیوں کو سلجھا لیا ہے تاریکی کی مانگ چیر کر اُجالا جنم لے گا اور دُہنی اُجالا میری زندگی کو ایک نئے موڑ کی جانب لے جائے گا۔ میں اُن سے سب کچھ کہوں گی، میرے دِل کا بوجھ کم ہوگا اُن کے دُکھ بٹ جائیں گے۔ اِن کے چہرے کی مایوسیاں ساون کے بادلوں کی طرح چھٹ جائیں گی۔!

نیند کے خمار سے میری پلکیں جھکنے لگی ہیں۔ اب میں سونا چاہتی ہوں لطیف خوابوں کو پلکوں کے اندر دبا کر۔!

---

دِن ڈھل چکا ہے۔ میں صبح سے اپنے کمرے سے باہر نہیں نکلی ہوں باہر شور ہے، زندگیاں دوڑ رہی ہیں۔ لیکن میں اس دوڑ میں شامل ہونا نہیں چاہتی۔ میرے قدم تھک گئے ہیں۔ ان میں اب دوڑنے کی سکت نہیں، آج مجھے اُجالے سے بھی نفرت ہے، ہنگاموں سے جی گھبراتا ہے۔ میں کھڑکیوں کے پردے گرا کر بیٹھی ہوں۔ سامنے آج کا اخبار ہے اور نظریں اُس تصویر پر جمی ہیں جس کی ہیئت میرے آنسوؤں نے بگاڑ کے رکھدی ہے۔

میں سوچ رہی ہوں۔ میں جو کچھ اُن سے آج کہنے جا رہی تھی۔ کاش وہ کل ہی کہہ دیا ہوتا۔ تب میری حالت یُوں نہ ہوتی اور اُن کی تصویر اور اس کے ساتھ چھپی لطیفہ خبر میری ڈائری کا ایک معمہ نہ ہوتی۔!!!

دسمبر ۱۹۷۲ء

# کالی تصویریں

..... افسانے کے کرداروں کو ایک نئی ٹیکنیک کے ذریعہ روشناس کرانا صرف محترمہ غزالہ پر دین کے حصہ میں آیا ہے۔ دلچسپ طرز بیان، مختصر اور پرمعنی جملے پیرا ادب نواز کو اپنے خیالات قلمبند کرنے پر اکساتے ہیں، محترمہ موصوفہ کا تازہ افسانہ "نئی ڈگر پر" واقعی قابلِ داد ہے جس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے...

یوسف کمال —— سرینگر

[اقتباس از کالم "آپ نے لکھا ہے"]

---

برم نگر
۲۵ر اپریل

ڈیر یوسف کمال

خلوصِ بے پایاں۔!

محترمہ غزالہ پر دین کے افسانے پر تمہاری تنقید ماہنامہ "آبشار" کے موقر کالموں میں دیکھی۔ یقینی کمال، تم نے تو کمال کر دیا۔ تنقید سو فیصدی صحت مند ہے۔ یہاں تو ایسے تنقید نگاروں کا قائل بھی نہیں، جو پڑھے بغیر ہی

افسانوں پر تنقید کرتے ہیں۔ یہاں تک سنا ہے کہ کچھ افسانہ نگار فرضی ناموں سے ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالتے ہیں۔ نوک جھونک کو کہاں سے ادبی پرائز آتے ہیں۔

غزالہ پروین ایک پختہ قلم کا نام ہے — وہ کہاں کہاں نہیں پہونچتا — میں بغیر کسی لگی پٹی کے یہی کہوں گا کہ وقت کی نبض پر اس کی مضبوط گرفت ہے — میں خود ایک قلم کار ہونے کے ناطے اس کے فن کا گرویدہ ہوں۔ اس کا ہر افسانہ اپنی اولین فرصت میں پڑھتا ہوں۔

یار اب تم سے کیا پردہ — مجھے صرف اس کی تحریر سے ہی نہیں، بلکہ اس کے نام کے ساتھ رغبت ہے۔ میں گھنٹوں اس کے خیالی پیکر سے باتیں کرتا ہوں۔ خیر جانے دو، پھر کبھی تفصیل سے لکھوں گا۔

اور ہاں، میرے افسانوں پر بھی کبھی قلم کو ہلکی سی جنبش دیا کرو۔ خامیاں بھی دور ہوں گی — !

تمہارا — عارف جاوید

---

غزالہ پروین میرے دل کی ہر دھڑکن میں سما چکی ہے۔ ہر پل بس اسی نام کی گونج کانوں میں سنائی دیتی ہے۔ غزالہ جس کی تحریروں سے میں ایک خیالی پیکر بناتا ہوں۔ اُسے نظروں سے سجاتا، سنوارتا ہوں — کاش کبھی ہمارا سامنا ہوتا — ! کیا ایسا ممکن ہے — ؟ کیا کبھی ایسا ہوگا — ؟

میں بھی کیسا بے وقوف ہوں — صرف نام کو پوجتا ہوں۔ جسے کبھی دیکھا نہیں، اُسے تصوری جامے پہنانے لگ جاتا ہوں — گوری چٹی، دراز قد، بڑی بڑی آنکھوں والی — نہیں، نہیں — گندم رنگت، میانہ قد، لہراتی اور گھنیری زلفیں

کیسی ہوگی وہ ۔۔ ؟

اب تو صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہے ۔۔ کچھ نہ کچھ کرنا ہی پڑے گا۔ دنیا والوں کی نظر میں وہ ناشائستہ حرکت ہی کیوں نہ ہو۔

فرضی نام ۔۔ ہاں، عارف جاوید کے بجائے عارفہ زلیخا۔ دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے ۔۔ !

پہلے ملاقات کا بند و بست ہو جائے تب اُسے اصلیت بتاؤں گا۔ اپنی چاہت کا یقین دلاؤں گا۔ مجھے یقین ہے اس کا دل پسیج جائے گا۔ قلم کار وہ ہرگز سنگدل نہیں ہوسکتی ۔۔ !

[تذبذب کے عالم میں لکھا ہوا ڈائری کا ورق]

۰۰۰۰ عارفہ زلیخا کا اوّلین افسانہ "کالی تصویریں" آج کے کوڑھی سماج پر بلا کا طنز ہے۔ واقعی ہمارے یہاں "روحی" جیسی لڑکیوں کے ساتھ زیادتی سے کام لیا جاتا ہے۔ یہ کہانی اتنی دلدوز تھی کہ میرے آنسو لاکھ ضبط کرنے کے باوجود بھی نہ رُکے۔ میری طرف سے انہیں ایسی کہانی تخلیق کرنے پر مبارکباد

— — — — — — — — — — — —

۰۰۰۰ کالی تصویریں ایک اچھوتا پلاٹ ہے۔ عارفہ زلیخا کا نیا تجربہ نہایت ہی کامیاب اور قابلِ ستائش ہے۔ یہ تو ابتداء ہے انتہا کیا ہوگی ۔۔ ! انہوں نے پہلے ہی قدم پر مزالہ پروین کو پیچھے چھوڑ دیا۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ !

۔۔۔۔۔ کالی تصویریں بالکل پھیکی لگیں۔ عارفہ زلیخا اکثر کرداروں کو ہینڈل کرنے میں ناکام رہی ہے۔ پھر بھی منظر کشی خوب ہے۔۔۔۔۔۔۔۔!

[اقتباسات از کالم "آپ نے لکھا ہے"]

بسنت نگر

۲۱ رمئی —

ڈیر عارفہ زلیخا

آداب خلوص!

"کالی تصویروں" کی نقاب کشائی پر مبارک باد۔

اردو افسانوں کی روایتی تیکنیک سے ہٹ کر، تمہارا یہ نیا تجربہ میرے من کو خوب بھایا۔

میں اکیلی تو "آبشار" کی ادبی محفل میں اکتا چکی تھی۔ تمہارے افسانے کو پڑھ کر میرا حوصلہ کچھ تو بڑھا۔ مجھے فخر ہے، ہم مردوں سے کسی بھی میدان میں پیچھے نہیں۔! امید ہے — آئندہ بھی لکھتی رہو گی۔

اور ہاں — تم سے ملنے کی خواہش بری طرح سینے میں مچل رہی ہے — کیا تم مجھ سے ملنے کی زحمت گوارہ کر لو گی — ؟

تمہاری اپنی —— غزالہ پروین

بھرم نگر

۳۱ رمئی —

ڈیر غزالہ!

بہت بہت پیار! تمہارا خط ملا۔ "کالی تصویریں" پسند فرمانے کا شکریہ!

ہمارا سماج تو ایسی لاتعداد تصویروں کی نمائش گاہ ہے۔ ابھی تو میں نے چند ایک کی نقاب کشائی کی ہے۔ زندگی نے ساتھ دیا تو ایک ایک کرکے باقی تصویروں سے بھی پردہ سرکاؤں گی۔۔!

بخدا تم نے پہل کرکے بازی جیت لی۔ میں بھی تم سے ملنے کے لئے کب سے بےچین ہوں۔ تم جہاں اور جس وقت ملنے کو کہو، میں حاضر ہو جاؤں گی۔ بس!!

تمہارے فن کی گرویدہ ——
عارفہ زُلیخا

---

بسنت نگر
۲۸ جون ——

ڈیر عارفہ

آداب خلوص!

تمہارا تازہ افسانہ "پھولوں کی آنچ" دو رُخے کردار والے انسانوں پر کاری ضرب ہے۔ میمونہ کے کردار نے متاثر کیا۔ میں یقین کے ساتھ کہتی ہوں کہ تمہارے نزدیک میں کچھ بھی نہیں۔!

۹ جولائی تین بجے میں زنانہ کالج کے سامنے تمہارا انتظار کروں گی۔ مجھے اُمید ہے تم ضرور آؤ گی۔ خط مختصر ہی کر لوں تو اچھا ہے۔ اب تو زبانی بہت کچھ کہنا اور سننا ہے۔ یاد رہے ۹ جولائی ٹھیک تین بجے۔۔!

تمہاری اپنی —— نزالہ پروین

---

۱۰۔۰۰۰۰ جولائی۔ معلوم ہوا ہے کہ کل پولیس نے زنانہ کالج کے

حاشیے دو ٹیڈی بوائز کو اُس وقت دھر لیا جب وہ کالج ہذا کے سامنے مشکوک حالت میں علیحدہ علیحدہ کھڑے نظر آ رہے تھے۔ یاد رہے گذشتہ دنوں ایک مقامی سینما ہال میں نیشنل کالج کے کئی منچلے لڑکوں نے زنانہ کالج کی طالبات کے ساتھ نازیبا حرکتیں کی تھیں۔ پولیس تب سے حرکت میں آ گئی ہے اور مشتبہ لڑکوں کی گرفتاری کا سلسلہ ابھی بھی جاری ہے۔۔۔۔۔

[ایک اخباری کٹنگ]

ستمبر ۱۹۷۱ء

---

# بھولے مسافر

پیاری تسنیم!

۲۵ر جنوری کے "آفتاب" میں میرا افسانہ - جہلم کے کنارے - کیا چھپا کہ
س تہلکہ مچ گیا - قارئین کے درمیان اچھی خاصی قلمی جنگ کا آغاز ہوا - کسی
نے مجھے افسانے کی ٹیکنیک سیکھنے کو کہا - کوئی مجھے لڑکا ثابت کرنے پر تُل گیا اور
وئی لکھنے سے پہلے بھرپور مطالعہ کرنے کا مشورہ دینے لگا - خیر اپنے اپنے خیالات
یں - ہر کسی کو اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کا حق ہے -

یہ تو تھا تصویر کا ایک پہلو - لیکن تعجب تو اُن خیالات کو پڑھ کر ہوتا
ے جو بس افسانے کے عنوان کیساتھ میرا نام دیکھ کر ہی کئی ذہنوں میں جنم لیتے ہیں -
کچھ حضرات مجھے وادی کی واحد خاتون افسانہ نگار کہنے پر بضد ہیں اور کچھ حضرات
یسی تعریفیں کرتے ہیں - جن کی میں قطعی مستحق نہیں - لیکن تم نے بھی حد کر دی،
فسانے کی خامیوں کو نظر انداز کر کے بس تعریفوں کے پل باندھ لئے - تمہارا کہنا
رست ہے، واقعی افسانے کا مرکزی کردار بھول بھلیوں میں کھو گیا ہے اور
س طرح سے رضیہ کے کردار نے سبقت لی ہے - کیسے نہ اُس کا کردار سبقت لیتا -

آخر اپنی ہم جنس جو ٹھہری - میرے اپنے جذبات جو ہو بہو دیسے ہی کئی سال
صرف اپنے آئیڈیل کے تلاش میں ہوں۔

ویسے آج کل ایک نوجوان کے خدوخال نے تذبذب میں ڈال رکھا ہے
وہ دھیرے دھیرے میرے آیڈیل کے ساتھ مدغم ہو رہے ہیں لیکن کبھی کبھی ا
کی چبھتی نگاہیں میرے تن بدن میں نفرت کی چنگاریاں بھر دیتی ہیں۔ ایسا لگ
ہے جیسے وہ اُن ان گنت نوجوانوں میں سے ہو جن کو ہمارا سماج ٹکسال سے
نکلتے ہوئے نوٹوں کی طرح جنم دیتا ہے۔ ہر روز نئے ہی انداز میں میرے س
آکر وہ شائد اپنی امارت کا رعب مجھ پر جمانا چاہتا ہے دل میں یہی خیال رکھ
کہ ایک سوکھے پیڑ کی ہری ڈالی کب تک نہ جھکے گی۔

نہیں تسنیم! وہ میرا آئیڈیل ہو ہی نہیں سکتا — بات کہاں سے
کہاں پہنچی ذکر چھیڑا تھا افسانے کا اور میں اپنے آئیڈیل کا تذکرہ لے بیٹھی۔
تم اپنی سناؤ — کس ڈگر پہ ہو بات ہو بھی سکی یا ویسے ہی دل
دبائے بیٹھی ہو۔

(تمہاری اپنی ——— تمثیلہ شاد)

---

کسی اجنبی کے سامنے الفاظ کو ترتیب دینا کس قدر مشکل ہو جاتا ہے
خاص کر اس وقت جب سامنا کسی خوبصورت لڑکی سے ہو۔ کوئی میرے اس
خیال کے ساتھ اتفاق کرے یا نہ کرے میرا تجربہ تو یہی کہتا ہے۔ پورے
ایک مہینے سے بس پہل کرنے کے لئے موزوں الفاظ تلاش کر رہا ہوں

کاٹ چھانٹ کے جن الفاظ کو ذہن میں محفوظ رکھتا ہوں۔ اُس کا سامنا ہوتے ہی وہ ہونٹوں پر آ کے پگھل جاتے ہیں۔ سوچتا ہوں کہیں میرے سیدھے بول مجھے چھپکلے کی ڈگر پر نہ پہنچا ئیں۔ اُسے دیکھتے ہی مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے۔ جیسے میرا فن ادھورا ہے، جس کی تکمیل اُس کے بغیر ناممکن ہے ـــ لیکن میں بات کر سکوں، تب نا ـــ

[ظفر جاوید کی ڈائری کا ایک ورق]

---

دلال محلہ

پیاری تسنیم!

خدشہ ہے کہ کہیں آئیڈیل ڈھونڈتے ڈھونڈتے خود ہی کھو نہ جاؤں کل کو میرا ہی فسانہ کوئی نہ لکھنے بیٹھے۔

ہاں تو کل کا واقعہ سنو۔ اچانک اُس مبہم آئیڈیل سے مڈبھیڑ ہوئی مجھے دیکھتے ہی اُس کی آنکھوں کی وہ عجیب و غریب چمک عود آئی۔ میرا تو مارے ڈر کے رواں رواں کانپنے لگا۔ جب کافی دُور تک اُس نے میرا پیچھا نہ چھوڑا تو میں نے ہمت یکجا کر کے اُسے وہ سبق سکھایا کہ عمر بھر یاد رکھے گا۔ نہ جانے اُس وقت مجھے ہو کیا گیا کہ جھٹ سے اُس کے مُنہ پر ایک زوردار تھپڑ رسید کیا۔ اُس نے ایک حسرت بھری الوداعی نظر مجھ پر ڈالی اور لال چوک کی گہما گہمی میں گم ہوا۔ مجھے یقین ہے کہ اب وہ اپنی شکل بھی مجھے دکھانا گوارہ نہ کرے گا۔

لیکن تشنہ تو میں اب بھی ہوں۔ وہی آئیڈیل کی تلاش شاید صدیوں ہی پیاسی رہوں گی۔

"آفتاب" کو نیا افسانہ بھیج چکی ہوں۔ چھپ جائے تو ضرور اپنی رائے دینا۔
لیکن یاد رہے وہ پہلی سی تنقید نہیں۔
اور ہاں میرا اولین ناول "اجنبی پیس" آج کل اپنے آخری مرحلوں میں
ہے۔ مکمل ہو جائے تب ہی چھپانے کا سوال اٹھتا ہے ؛
تمہاری اپنی ـــــ شگفتہ شاد

---

...... کل شام رینگل چوک کے قریب ایک نوجوان، تیز رفتار
ٹرک کی زد میں آ کر بُری طرح زخمی ہوا، اُسے بے ہوشی کی حالت میں ہسپتال
پہنچایا گیا۔ جہاں اُس کی حالت تشویشناک بتائی جاتی ہے ........
(ایک اخباری خبر کا اقتباس)

---

دلال محلہ
پیاری تسنیم!
تمہارے خط کا جواب نہ دے سکی جس کے لئے معافی کی خواستگار ہوں،
تم نے ٹھیک ہی اندازہ لگایا ہے۔ تب سے وہ مجھے نظر نہ آیا۔
میری حالت آج کل غیر ہوئی ہے بھاری کمی سی اپنے اندر محسوس کرتی
ہوں۔ ایک خلاء ـــ جو شائد اب کبھی نہ پُر ہو گئی۔ لیکن اب ہو ہی کیا سکتا ہے،
اب تو ملنے کی کوئی امید ہی نظر نہیں آتی۔ نگاہیں تھک گئی ہیں اُسے ڈھونڈتے،
... ہفتہ بھر سے قلم بھی ہاتھ میں نہ اُٹھایا۔ ایسا لگتا ہے جیسے اب میری
زندگی کا کوئی مقصد ہی نہیں۔ تم بھی دُعا کرو ـــ وہ مل جائے ؛
تمہاری ـــ تسنیم شاد

شائد یہ میری ڈائری کا آخری ورق ہے۔

—— آج میں بہت کچھ لکھنا چاہتا ہوں۔

—— لیکن وقت بہت کم ہے آج مجھے الفاظ ترتیب دینے کے لئے بھی وقت نہیں۔ کون جانے کب موت کے سائے، جو میرے گرد منڈلا رہے ہیں۔ مجھے دبوچ لیں۔ مجھے موت سے ڈر محسوس نہیں ہوتا۔ مجھے دُکھ ہے تو اس بات کا کہ اس ڈائری کے آخری ورق کی طرح میرا فن بھی ادھورا رہے گا۔ وہ فن جو ثمینہ کی تصویر کی بنا نامکمل ہے۔

ثمینہ —— جس کے چہرے کے نقوش میں مجھے اپنے فن کی تکمیل کا خاکہ نظر آیا تھا۔ جنہیں میں کینوس پر اُتارنا چاہتا تھا۔ لیکن یہ سب اس کی مرضی کے بغیر کیسے ممکن تھا۔ میں نے کئی بار اس سے بات کرنا چاہی لیکن اس کی پُر وقار شخصیت مجھے ہر بار مرعوب کرتی گئی۔ میں کچھ نہ کہہ پایا——

اُس نے میری فن کارانہ نگاہوں کو غلط سمجھا۔ کچھ اور ہی مطلب نکالا جس کا خیال بھی کبھی میرے دل میں نہ آ سکا تھا۔

اب کچھ بھی نہیں ہو سکتا ہے۔ وقت نکل چکا ہے۔

ثمینہ —— میرے فن کی محرک۔ شاید میری یہ ڈائری تمہارے لئے کارآمد ثابت ہوگی۔ کیونکہ یہ ایک مصور کے خوابوں کی پوری کہانی ہے۔!

(ظفر جاوید کی ڈائری کا ایک ورق جو اُس نے ہسپتال کی نرس سے لکھوایا تھا)

---

.... گذشتہ روز ریگل چوک کے قریب ایک نوجوان مصور کو حادثہ

پیش آیا تھا۔ کل شام اُس نے ہسپتال میں دم توڑ دیا۔ ہمارے نمائندے کے کہنے کے مطابق مرحوم اپنی ذاتی ڈائری کسی ثمینہ شاد کے نام چھوڑ گئے ہیں جس کی تلاش جاری ہے۔

(ایک اخباری خبر کا اقتباس)

---

..... کہانی کاروں کی اپنی زندگیاں حوادثات سے بھری پڑی ہوتی ہیں۔ اگر ایسا نہ ہو تو ان کا قلم کسی شاہ کار کو جنم نہیں دے سکتا۔

ثمینہ شاد کا "اجنبی دیس" ایک شاہکار ناول ہے جو تقریباً تین سال کے بعد چھپ کر مارکیٹ میں آ گیا ہے۔ ناول کا ہر باب ایک حادثہ پر ہی اختتام پذیر ثمینہ کی زندگی تو ایسے ہی حادثوں سے بھری پڑی ہے جبھی تو تحریر اتنی سحر انگیز ہے۔ یہی کیا کم ہے کہ تین سال پہلے کے حادثے نے اس کے قلم کو ایک نئی توانائی بخشی ہے۔ جس حادثے کی یاد آج بھی "اجنبی دیس" کے اس انتساب سے تازہ ہوتی ہے۔

° اپنے آئیڈیل ظفر جاوید کے نام ——

جواب صرف ایک یاد ہے اور ایک زخم —— جو ہمیشہ ہرا رہے گا۔ جو کبھی نہیں بھر سکتا جس کے گوشوں سے آج بھی لہو ٹپک رہا ہے —!

(تسنیم قادری کے خیالات کا اقتباس)

---

# قدم، رستہ اور منزل

لوگوں کے ٹھاٹھیں مارتے سمندر میں شاردا، سفید ساڑھی اوڑھے آسمانی حور لگ رہی ہے۔ اس کے چہرے پر دُکھ کی ہلکی سی پرچھائیں تک نہیں۔ متانت اور سنجیدگی سے بھرا ہوا چہرہ۔!

جنگ میں کارنامے سرانجام دینے والے مادرِ وطن کے سپوتوں کو اعزازات سے نوازا جا رہا ہے۔ جنہوں نے اس کی حفاظت کرنے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اور جو شہید ہوئے اُن کے عزیزوں کو بھی تمغے اور سندیں دی جارہی ہیں۔

شاردا بھی اُن ہی میں سے ایک ہستی ہے۔ اُس کا پتی کیپٹن ساگر سنگھ جموال مادرِ وطن کی حفاظت کرتے کرتے شہید ہوگیا۔

"شریمتی شاردا دیوی، بیوہ کیپٹن ساگر سنگھ جموال" ڈائس سے آواز سنائی دیتی ہے۔ وہ ڈائس کے بالکل قریب بیٹھی ہے۔

وہ عزم و استقلال سے کرسی چھوڑتی ہے۔ دو قدم اٹھاتی ہے

کے ہاتھ سے سونے کا تمغہ لے کر، پل بھر کے لئے اس کا ہاتھ کانپنے لگا ہے۔ وہ واپس مڑتی ہے۔ لوگوں کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر۔ تالیوں کی گونج میں اسے صرف ایک ہی آواز سنائی دے رہی ہے۔

"ستاردا۔ ساگر، ساگر سے جا ملے گا۔۔۔"

اس کی نظریں دور دور تک کچھ تلاش کرنے لگی ہیں۔۔۔!

---

ستاردا ایک طوفانی ندی تھی۔ جس پر بندھ باندھنا آسان نہ تھا۔۔۔ سینکڑوں نوجوان اس پر دل و جان سے فدا تھے۔ لیکن وہ بے پرواہ ہو کر اپنے ہی شوخیوں میں سمٹے بہتی رہی۔ اتنی بھولی بھی نہ تھی کہ ان نگاہوں کو نہ پڑھ سکتی، جو اس پر اٹھتیں تھی۔ اسے اپنے حسن پر ناز تھا نہ وہ مغرور تھی۔

ندی میں ٹھہراؤ آنا قدرتی عمل ہے۔ وہ آخر اس مقام پر پہنچی جہاں پر اس کی شوخیوں کی جگہ متانت نے لی۔ ندی کو آخر ساگر سے جا ملنا ہی پڑتا ہے ندی ساگر میں سما گئی۔ شادی سے قبل اس نے ساگر کو دیکھا نہ تھا۔ اس نے تو صرف ایک خیالی تصویر من میں بسائی تھی۔ درمیانہ قد، چوڑا چکلا سینہ، آنکھوں میں ساگر ایسے نیلگوں پانیوں کی نیلاہٹ۔۔۔!

خیالی تصویر بالکل صحیح ثابت ہوئی۔ تصور نے جیسی تصویر گھڑ لی تھی۔ ساگر بالکل ویسا ہی تھا۔

جب ساگر نے اس کا گھونگھٹ الٹ کر بتی گل کر دی تھی تو وہ مارے خوف سے کانپ اٹھی تھی

جانے اب کیا ہو گا ۔ ؟

لیکن ہوا کچھ بھی نہیں ۔ بس چند سرگوشیاں بے کراں سناٹے میں ابھریں ۔ پھر جی بھر کے باتیں ہوئیں، سہاگ رات منی ۔ شاردا ساگر میں ڈوب گئی ۔ اس ڈوبنے میں ایک لذت تھی ۔ !

رات ڈھل گئی، شاردا کو نئے سانچے میں ڈھال کر ۔ وہ پو پھٹنے سے پہلے بستر چھوڑ چکی اور ساگر اوندھے منہ لیٹا ہوا، جیسے لمبی مسافت طے کر کے لوٹا ہو اجنبی، جنم کے ساتھی بن گئے ۔ !

شاردا نے اس کے پیر چھوئے اور کمرے سے باہر آ گئی ۔

---

وہ گھڑی شاردا کے لئے کتنی جان لیوا تھی ۔ ساگر چھٹیاں گذار کر واپس جا رہا تھا ۔ گھر کے ہر فرد سے اجازت لے کر اس نے شاردا کی جانب دیکھا ۔ اسکی آنکھوں میں چھلکتے آنسو دیکھ کر اس کے قدم جم گئے ۔ وہ واپس مڑا اور اسکی جانب بڑھنے لگا ۔ لیکن تب تک وہ اپنے کمرے میں پہنچ چکی تھی ۔

بیڈ پر اوندھے منہ لیٹے وہ سسکیاں بھر رہی تھیں ۔ تکیہ آنسوؤں سے بھیگ چکا تھا ۔

ساگر نے اسے جھنجھوڑا، پیار سے اس کے الجھے گیسوؤں کو سنوارنے لگا ۔

" کیوں ۔۔۔ نہ جاؤں ۔ ؟ " آواز میں قدرے لرزش تھی ۔

شاردا برابر سسکیاں بھر رہی تھیں ۔

" شاردا ۔ ایشور کے لئے اٹھو، مجھے ہنستے ہنستے رخصت کرو ۔ نہیں تو

میں جانہ پا سکوں گا۔ تمہاری یہ سسکیاں میں اپنے ساتھ لینا نہیں چاہتا۔!"

وہ اٹھی اور ہونٹوں پر تبسّم بکھرتے ہوئے، اس کی نگاہوں کی گہرائیوں میں ڈوب گئی۔

بوجھل ماحول پل میں جانے کہاں گیا۔۔۔

اس رات انہوں نے جی بھر کے باتیں کی تھیں۔ اُسی رات شارؔدا نے اُسے ایک خوشخبری سُنائی تھی۔ جسے سُن کر ساگر نے خوشی کے ساگر میں ڈوب کر اسے خوب زور سے بھینچا تھا۔ سہاگ رات ایسی شرم کی لالی اس کے چہرے پر رقص کرنے لگی۔ اور نیچی نظروں نے پوچھا تھا۔۔۔

"ساگر۔ شارؔدا کو وہاں جا کے بھول تو نہ جاؤ گے۔۔؟"

"ساگر، ساگر میں ڈوبنے جا رہا ہے۔ لیکن وہاں بھی شارؔدا ساتھ ہوگی۔!"

وہ ناراض ہو گئی تھی۔

"کیسی بدشگونی بات مُنہ سے نکالی۔ ساگر شارؔدا میں ڈوب رہا ہے۔ بس بھگوان سے اتنا ہی کچھ مانگتی ہوں۔"

ناراض کیوں ہو گئی۔ سچ ہی تو ہے۔ ساگر، ساگر سے ملنے نہیں جائے گا تو اور کہاں جائے گا۔ ڈیوٹی آخر ڈیوٹی ہے۔ ہاں، اس نیلگوں پانیوں کے ساگر میں اپنی شارؔدا کی شبیہہ ہمیشہ جھلملاتی رہے گی۔ میں جب لوٹ آؤں گا، تب شارؔدا کے گود میں۔ ۔ ۔ ۔"

"ہٹیئے۔۔ اس نے بات کاٹ دی تھی۔

اور ساگر، شارؔدا کے اُسی ہلکے تبسّم کو سمیٹ کر رخصت ہوا تھا۔

اچانک جنگ کے شعلے بھڑک اُٹھے۔ جنگ پہلے بھی تھی۔ لیکن اتنی شدت نہ اختیار کر لی تھی جو پچھلے چند روز سے اختیار کر گئی۔

شاردا دسوسوں کے ساگر میں ڈوبے اپنے اُس ساگر کی سلامتی کی دُعائیں مانگنے لگی جو مادرِ وطن کے سمندری راہوں کی حفاظت پر لگا تھا۔

وہ سوچتی ــــ جنگ کیوں ہوتی ہے ــ کیا اس کے پیچھے بھگوان کا ہاتھ ہے جنگ کا محاصل کیا ہے ــــ ؟

اُس کی نظریں دُور آسمانی وسعتوں میں ان لڑاکا طیاروں کی طرف اُٹھتیں جو چیل کوؤں کی طرح ایک دوسرے پر جھپٹ پڑتے تھے۔

کون جیتے گا ــ ؟ ذہن سے سوال ابھرا اور دل نے جواب دیا ــ کوئی نہیں ــــ جنگ جیت کر بھی تو ہار رہی ہے ــ کتنے سہاگ اُجڑتے ہیں۔ کتنی ماؤں کی گودیں خالی ہو جاتی ہیں کتنے بچے یتیم ہو جاتے ہیں ــــ

وہ کانپ اُٹھی ــــ !

جنگ، نفرت سے بنا ایک غلاف ہے جو انسان اپنے چہرے پر چڑھاتا ہے ــــ لیکن وطن کی حفاظت، وہ بھی تو اس کے بیٹوں کا فرضِ اولین ہے ــ !"

یہ سوچ کر اس نے اطمینان کا سانس لیا ــ !

جنگ کے کالے بادل چھٹ گئے، وقتی طور، ہمیشہ کے لئے تو نہیں ــــ جنگیں ہوتی رہی ہیں اور ہوتی رہیں گی۔ جب تک دنیا قائم ہے، یہ سلسلہ چلتا رہے گا ــــ انسان، انسان سے لڑے گا۔ وحشی بنے گا ــ نفرت دنیا سے

کبھی نہ جائے گی۔ ہاں امول جائیں جائیں گی ۔۔۔ اپنے پیچھے ایک تاریخ چھوڑ کر، آنے والی نسلوں کے لئے مشعلِ راہ چھوڑ کر ۔۔۔ !

---

شاردا کا سُہاگ ابھی ابھی لُٹا ۔۔۔ کلائیوں میں قوس قزح کے رنگوں ایسی کانچ کی کھنکتی چوڑیاں ٹوٹ کر بکھر گئیں۔

ٹیلی گرام کے الفاظ اس کو بہت سارے کالے ناگ لگے جو اس کے جسم کو ڈس رہے تھے۔

اُس کی آنکھیں آسمان کی طرف اُٹھ گئیں ۔۔۔ کالے کالے بادل اُس کی نیلاہٹ کو نگل رہے تھے ۔۔۔ !!!

فروری ۱۹۷۳ء

---

# اپنی بات

تاریکیوں میں پلا، اُجالے کا متلاشی ـــــ!

میں ہوں م۔م صدّیق ـــــــ!!

دنیا نے بہت کچھ چھین لیا اور دیا بھی کیا ـ قدم قدم پر ٹھوکریں ـ!!!

شاید اسی لئے میرے غمگسار دوست اور بھائی جناب مُنیر احمد مؔنیر اکثر کہا کرتے ہیں ـــ "م۔م صدّیق چوٹوں کی موت مرے گا ـــ!"

میں چوٹ پر چوٹ سہہ کر بھی زندہ ہوں، ممکن ہے اُن کی یہ پیشگوئی غلط نکلے ـــ!

اندھیروں میں بھٹکتا ہوں ـــ اسی آس کے سہارے، اندھیرے چھٹ جائیں گے ـ زخم مندمل ہوں گے، اُجالا جنم لے گا ـــ

ہاں جب تک سانس باقی ہے، کشمکش جاری رہے گی ـ رُک جائے گی تو حسرت لے کے جاؤں گا ـــ

بچپن سے دُکھ جھیلے ہیں ـــ سنجیدگی جنم سے ملی ہے ـ اپنا مُنّا (شمس الدین شمیم) تو سچ ہی کہتا ہے ـــ "م۔م صدّیق اُس بیکراں خاموشی کا نام ہے جو موت اور زندگی کے درمیان ہوتی ہے ـــ"

دُکھوں میں بھی تبسّم کا دامن نہیں چھوڑتا۔ لبوں پر ہر وقت اسی
کا رقص ہوتا ہے ـــــ!

اپنے ایک عزیز دوست طاہر رحمان کہا کرتے ہیں ” درد کا دوسرا
نام، م۔م صدّیق ہونا چاہیئے۔“

ماں کی حقیقت نگاری نے متاثر کیا اور افسانہ نگار کوئی متاثر
نہ کر سکا۔ ماں کی سسکتی زندگی نے اس درجہ متاثر کیا۔ قلم ہاتھ آیا۔
لکھتا ہوں اور لکھتا رہوں گا۔ کیا لکھتا ہوں خود نہیں معلوم ـــ!

لگ بھگ چالیس افسانے لکھ چکا ہوں۔ زیر نظر مجموعہ میں کچھ
شامل ہیں۔ مجھے یقین ہے۔ ان میں خامیاں ضرور ہوں گی۔ اُن خامیوں
کو اُجاگر کرنا نہ بھولئے گا ـــ!

آخر میں بقولِ منیرؔ یہ کہہ کر رخصت ہوتا ہوں ؎

خوب چھپاتا ہوں بربادی کو اپنی یاد کر
دوسروں کا کیا گلہ خود ہی ستم ایجاد ہوں

م۔م صدّیق

فروری ۱۹۷۳ء

# اُجالوں کی صلیب

گھرے اندھیرے کے ساتھ میں ڈوبنے اُبھرنے لگتا ہوں۔ یہ بھیانک تاریکی
پھن اُٹھائے مجھے ڈسنے کا موقعہ تلاش کر رہی ہے

میں فرار چاہتا ہوں اس تاریکی سے، ان روشن نقطوں سے، جو میرے
ذہن کے کینوس پر اُبھر اُبھر کر ڈوبتے ہیں۔ اور ڈوب ڈوب کر اُبھرتے ہیں ان
روشن نقطوں نے مجھے مفلوج کر چھوڑا مجھے ناکارہ بنا دیا — دل کی جگہ ڈنک
مار مار کر ہر نقطہ روشن ہوتا گیا، وہ سبھی نقطے آج محوِ رقص ہیں میری بربادی کا
جشن منا رہے ہیں — ہاں جشن — ! میرے ارمانوں کی لاش نوچ کر، بے گناہوں
کے صف میں کھڑا، میرا تمسخر اُڑا رہے ہیں — !

اب وہ ستارے ہیں، نقطے ہیں، جنہیں چھوا جا سکے — میری پہونچ
سے بہت دُور — وہ آسمان کی وسعتوں میں جگمگا رہے ہیں —

میں بھٹک رہا ہوں — ان روشن ستاروں کو دیکھ کر کڑھتا
ہوں — میرے کڑھنے سے کیا ہوگا — اب تو روشنی ملنے سے رہی، ان ستاروں

کی روشنی، مدھم نہیں پڑ سکتی، وہ چمکنا نہیں چھوڑ سکتے ــ!

ہونی تو ہو کے رہتی ہے کس کے روکنے سے آج تک یہ ٹلی ہے ــ میں اندھیروں میں بھٹک رہا ہوں، ناہموار راہوں پر چلے جارہا ہوں، گرتا پڑتا، ٹھوکریں کھاتا ــ ابھی آس کے سہارے کوئی نقطہ ابھرے گا۔ مجھے راہ دکھائے گا۔ میری راہبری کرے گا ــ!

لیکن ــ!

کئی وسوسے ذہن کے دریچے پھلانگ کر مجھے روک رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں ــ اب کوئی نقطہ نہیں ابھرے گا۔ دل کش ہیکوں میں ڈھل کر تمہارے رُوبرو نہیں آئے گا۔ اب اس بھرم کو ختم ہونے دو، لوٹ آو، مکروفریب کی جانب۔ تمہیں سب کچھ ملے گا ــ تمہاری پُوجا ہوگی ــ کیونکہ آج کل مکروفریب کی ہی پُوجا ہوتی ہے ــ اب اگر کوئی نقطہ اُبھرے گا بھی، تو وہ تجھ سے روشنی کی آخری رمق بھی چھین لے گا جس کے سہارے تو ان اندھیروں سے لڑ رہا ہے۔

رات اپنے شباب پر ہے، مجھے لگتا ہے اس رات کا سویرا کبھی نہ ہوگا۔ یہ ڈھل تو جائے گا پر میرے ناکارہ وجود کو فنا کرکے ــ!

میں پیچھے مُڑ کر دیکھتا ہوں ــ چھوڑتے ہوئے قدموں کے نشان میرا تعاقب کر رہے ہیں اس پُرخار راہ پر جب میں چل پڑا تھا۔ تب آفتاب اپنی نصف مسافت طے کر چکا تھا۔ تب رات دُور کسی دلیس میں اپنا آنچل ڈالے ہوئے تھی۔ گمان بھی نہ تھا کہ اندھیرے اتنے گہرے ہوں گے۔

ابھی ابھی کی تو بات ہے ــ!

ہر سو روشنی کا پہرہ تھا۔ روپہلی دھوپ میں وہ نقطہ لکیروں میں ڈھل گیا تھا۔
قوس و قزح ایسے رنگ پھیلتے گئے اور ایک سیمین تن کی شکل اختیار کر لی تھی۔

دل شاد ۔۔۔!

ہاں وہ یہی نام لے کر میرے سامنے آگئی تھی۔۔ میں نے اسے ہر سانس
میں لبایا تھا۔ رگ و پے میں سمایا تھا۔!

"تم کون ہو؟" میں نے پوچھا تھا۔

"تمہاری منزل!" وہ آواز کانوں میں رس گھولتی ہوئی میرے دل میں اُتر چکی تھی

"میرا ہاتھ تھام کر جھٹک نہ دو گی۔" میں نے اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھاتے
ہوئے کہا تھا۔

"ایسا کیوں سوچتے ہو۔" اُس کے چہرے پہ حیا کا مہین پردہ لہرا گیا تھا۔

"اُجالے کے بعد اندھیرا بھی تو چھا جاتا ہے۔" اس کا چہرہ جذبات کی حدت
سے پگھلنے لگا۔

میں نے فرطِ مسرت سے اسے اپنے بانہوں کے حلقے میں جکڑ لیا۔ شرم سے
اس کا سر دھیرے دھیرے جھکنے لگا۔

"دلشاد ۔۔۔!" میرے دل کے گوشے سے آواز اُبھری تھی۔

"ہوں ۔۔۔" اس کی دھیمی سرگوشی سے میرے دل کی تار جھنجھنا اُٹھے تھے۔

"کیا تم اندھیروں میں بھی میرا ساتھ دو گی۔۔!" میں نے پوچھا۔

"ہاں۔ لیکن اُجالوں میں رہ کے تم اندھیروں کے بارے میں کیوں سوچتے ہو،
۔۔۔ تمہاری یہ فلسفیانہ باتیں مجھے بالکل اچھی نہیں لگتیں۔" وہ خفگی سے بولی تھی۔

"کیا اُجالے سدا ٹھہریں گے۔"

"پھر وہی فلسفہ۔" وہ باہنوں کا حلقہ توڑ کر رُوٹھ گئی۔

"دلشاد۔" میں پکار اُٹھا۔

"کیا ہے۔" اس کے لہجے میں تلخی گھل گئی۔

"للہ مجھ سے نہ روٹھو، اب کبھی ایسی باتیں نہ کروں گا۔" میرا لہجہ درد سے پُر تھا۔

وہ کھِلکھلا کر ہنس پڑی اور کہا۔ "اب اگر ایسی باتیں کیں تو میں سدا کے لئے رُوٹھ جاؤں گی۔"

"نہیں۔ نہیں۔ ایسا ظلم کبھی نہ کرنا" میں چلّا اُٹھا تھا۔

ہم دونوں چلتے گئے، ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے، آنکھوں میں بہاروں کے خواب بسائے۔

ایک نئی ڈگر کی جانب۔ جہاں سے ہمیں لوٹ کے نہ آنا تھا۔ پیچھے مُڑ کے نہ دیکھنا تھا۔ بس قدم آگے بڑھانے تھے۔

ابھی ہم دو کوس بھی نہ چلے تھے کہ محشر کا شور اُٹھا۔ دلشاد نے مُڑ کے کیا دیکھا۔ لوگوں کے اژدھام نے اُسے نِگل لیا۔ وہ کھو گئی، میں اکیلا رہ گیا۔

میں نے اُسے دُنیا کی بھیڑ میں تلاش کیا۔ خاک چھانی اور گرتا پڑتا بہت دُور نکل آیا۔

رات کی سیاہی اُجالوں پر غالب آگئی تھی اور میں نے صرف ایک آہ بھری اُن لمحوں سے چھٹکارا پانے کی غرض سے جو میرے ذہن کے ساتھ چپکے ہوئے

تھے۔ میں کلی طور پر ذہن کے کینوس کو صاف کرنا چاہتا تھا۔ یادوں کو کھرچ دینا چاہتا تھا، غلط اور سلط رنگوں سے رنگے کینوس کو پائیدار رنگوں سے سجانے کے لئے۔ پر وہ رنگ اتنے گہرے اور کثیف ثابت ہوئے کہ اُترنے کا نام ہی نہیں لیتے۔ پھر اس پُر خار راہ پر کئی نقطے اُبھرے۔ مختلف دلکش پیکروں میں ڈھل کر۔ پروین، خالدہ، میمونہ، ریتا، سروج، شلّی اور شبنم۔ مختلف نام لے کر ملتے گئے۔ ہر پیکر کی زبان پر بس یہی ہوتا۔ میں تمہاری منزل ہوں، وہ مجھ سے روشنی چھین کر آسمانی وسعتوں میں ستاروں کی صف میں جا کھڑا ہوئے۔ وہ وسوسے ذہن کے نہاں خانوں میں سو چکے ہیں۔ میں مبہم اُمید کے سہارے آگے بڑھ رہا ہوں۔ بادل دھیرے دھیرے چھٹ رہے ہیں۔ ستارے ٹمٹما رہے ہیں۔ دفعتاً ایک ساتھ کئی ستارے ٹوٹ کر تاریکی میں سما جاتے ہیں مجھے لگتا ہے جیسے میرے ذہن کے کینوس پر یہ اُبھرے روشن نقطے پاش پاش ہو رہے ہیں۔

میں اطمینان کا ایک گہرا سانس لیتا ہوں۔۔۔!!!

# پگھلتے رشتے

طیارہ رن وے چھوڑ رہا تھا۔ ایئر ہوسٹس کی مترنم آواز وقفہ وقفہ سے گونج رہی تھی۔ "پلیز ٹائٹ یور سیفٹی بیلٹس۔۔ تھینکس۔۔!"

بیلٹ کس کر میں اس لڑکی کے سراپا کا جائزہ لینے لگا جو میری ساتھ والی نشست پر لائف کے صفحے اُلٹ پلٹ رہی تھی۔

وہ اس موڑ کو پیچھے چھوڑ چکی تھی جہاں بچپن جوانی کے گلے ملتا ہے۔ میانہ قد، گندمی رنگت، بڑی بڑی گہری سیاہ آنکھیں، بال ترشے ہوئے بیچ بوائے سٹائل اور اوپر لے ہونٹ کے کنارے ہلکا ہلکا سرمئی غبار جو چہرے کی نمایاں خصوصیت تھا۔

اس کے خدوخال دلکش نہیں، لیکن بیل باٹم پر ہلکے آسمانی رنگ کے ڈھیلے ڈھالے کرتے نے اُسے پُرکشش بنا دیا تھا۔!

میں اُسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ غیر ارادی طور پر اس نے میری طرف دیکھا لبوں پر ہلکا تبسم بکھرا۔ اور دوبارہ لائف سے کھیلنے لگی۔۔!!

"محترمہ، بیلٹ کس لیجئے"۔ میں نے لفظ بلفظ تول کر کہا۔ کہیں اس کی خفگی اڑھائی تین گھنٹے کے سفر کو اذیت ناک نہ بنا ڈالے۔

"جی ۔۔۔" وہ چونکی اور اپنے لبوں پر "مونا لیسا" کی مسکراہٹ لاتے ہوئے کہا۔ "آپ مجھ سے مخاطب ہیں کیا۔ ؟"

"جی ہاں ۔۔ بیلٹ کس لیجئے ۔"

"اوہو ۔۔۔ میں تو بھول ہی گئی تھی۔" مونا لیسا کی مسکراہٹ گہری ہوتی گئی اور مخروطی انگلیاں سیفٹی بیلٹ کسنے لگیں۔

"آپ کہاں تک جا رہی ہیں ۔" میں نے سلسلۂ کلام ٹوٹنے نہ دیا۔

"جہاں یہ طیارہ لے جائے۔" اس کے آنکھوں میں عجیب چمک پیدا ہو گئی جسے میں کوئی نام نہ دے سکا۔

"تو ہماری منزل ایک ہے۔" ذومعنوی فقرہ کس کر میں نے موضوع کو ختم ہونے سے بچا تو لیا لیکن ڈر تھا کہ کہیں اس کا چہرہ غصہ کی لالی میں رنگ نہ جائے۔ برعکس اس کے سپید موتیوں ایسے دانتوں نے لبوں کی حصار توڑ دو، وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی ۔۔

"کیا ایسا ممکن ہے ؟ ۔"

"کیوں نہیں، ہم سفر جو ٹھہرے ۔۔ میں جذبات کی حدت سے پگھل رہا تھا۔ اس کا چہرہ جذبات کی رو سے بالکل عاری تھا۔ لیکن میں پگھلتا پگھلتے ہوا کے ساتھ تحلیل ہوتا گیا۔ طیارہ کی رفتار سے کہیں تیز ...

کرنا لگا — !!

"میں نے تمہیں گل کی نرم و نازک پنکھڑیوں میں دیکھا ہے۔ شبنم کی ٹھنڈک سے محسوس کیا ہے۔ تم وہ شبیہہ ہو جسے میرے تصوّر نے پال کے جوان کیا ہے، یقین مانو، یہ شاعرانہ باتیں نہیں، میرے دل کی آواز ہے۔"

"آپ تو ایک ہی سانس میں بہت کچھ کہہ گئے — دم تو لیا ہوتا، مجھے بھی کچھ کہنے کا موقعہ دیا ہوتا — اب کہنے کو باقی رہا ہی کیا — !"

"سچ — کیا تم بھی — !" حیرت و انبساط کے گھلے ملے لہجے نے اس سے پوچھا تھا۔

"ہاں ہاں — اس میں اچنبھا کیا — کیا آپ میرا تخیل نہیں ہو سکتے۔"

"یقین نہیں آتا —"

"کرنا ہی پڑے گا —"

اس کی نگاہیں دھیرے دھیرے میرے دل میں اترنے لگیں۔ میں نے وفورِ مسرت سے اس کے ملائم ہاتھ کو زور سے دبایا، ہونٹوں سے لگایا — وہ شرما گئی — اور منہ دوسری جانب پھیر کر ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرنے لگی۔

"اب یہ عمر بھر نہیں چھوٹے گا —" میں نے اس کی کلائی مضبوطی سے تھام لی — !

اس نے کوئی مزاحمت نہ کی — !

"تم نے اپنا نام نہیں بتایا۔ نہ بتاؤ۔ تم تو دل شاد ہو۔ ہاں میری دل شاد
۔ میں نے تمہیں اسی نام سے جانا ہے، پوجا ہے۔"!

"دل شاد۔ بڑا ہی خوب صورت نام ہے تمہارے تخیل کا۔ اور میرے
تخیل میں، تیری تلاش میں سالہا سال سے بھٹک رہی تھی۔" لمحہ بھر کے
لئے اس نے شرم کا، پردہ اپنے چہرے پر سے ہٹا لیا۔

"پھر کیا خیال ہے۔"

"کس کے متعلق" وہ بے چین ہو کر بولی۔!

"شادی"۔!

"اتنی جلدی۔ ابھی تو ملے ہیں، گھل مل بھی نہیں گئے۔"

"ائیمک دور ہے۔ پل میں کیا سے کیا ہو جائے۔!"

"لیکن یہاں۔"

"یہیں ائیرپورٹ پہنچتے ہی سیدھا کورٹ۔ بولو منظور۔"

"منظور۔!" اثبات میں جواب دیکر حیا کا مہین پردہ پھر سے چہرے
پر لہرا گیا۔

"مبارک ہو، اب آپ لائف پارٹنر ہو گئے۔!"

ایک پُر وقار آواز نے مجھے چونکا دیا۔

شادی کے رول کئے ہوئے سرٹیفکیٹ کو مضبوطی سے تھام کر
ہم دونوں ایک دوسرے کا سہارا بن کر کورٹ سے باہر آ رہے تھے۔

"ہنی مون کے لئے ہوٹل کیسا رہے گا۔" میں اسے چھیڑنے لگا۔

"ہٹئے۔ آپ پل میں بے شرمی پر اُتر آتے ہیں۔" وہ مصنوعی خفگی سے بولی،

"اس میں شرم کا کیا دخل۔ ابھی بھی اگر کوئی سرحد باقی ہے تو اسے بھی پھلانگیں گے۔" میں نے اس کے اور اپنے درمیان کے سارے فاصلے مٹا دیئے۔

"جیسے آپ کی مرضی ہے۔" وہ میرے سینے سے آلگی اور سر دھیرے دھیرے جھکنے لگا۔

ہوٹل اشوکا کی دیو قامت بلڈنگ کے سامنے ٹیکسی رُکی اور ہم دونوں ایک نئی ڈگر کی جانب قدم بڑھانے لگے۔ وہ مسرت سے ادھر ادھر جھول رہی تھی اور میرے قدم ہوا پر پڑ رہے تھے۔!

"شاد۔" میرے دل کے گوشوں سے آواز ابھری۔

"ہوں۔" دھیمی سرگوشی۔ جیسے کوئی بہت دور سے بول رہا ہو۔!

"کہاں کھو گئیں۔" میں نے اسے جھنجھوڑا۔

"سوچ رہی ہوں۔ مجھے توقع سے کہیں بڑھ کر ملا۔"

"مجھے نہیں۔!" میری باہوں کا دائرہ تنگ ہونے لگا۔

"چھوڑیئے۔ نہیں تو۔" اس کی شوخیاں عروج پر پہونچ گئیں۔

"نہیں تو کیا۔ میری نگاہوں نے جواب مانگا۔!

جواب میں اس نے اپنے مرمریں جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ نئی زندگی کی پہلی مہکتی، رات نے شام پر اپنے پیر ڈالے، کمرہ دلشاد کے کنوارے جسم کی

خوشبو سے بھر گیا۔ ایک ایسی خوشبو — جس نے مجھے مدہوش کر دیا — ہم دونوں کھو گئے — منزل کی چاہ میں — !

ہر صبح ہمیں شام کا احساس دلاتی رہی اور شام مہکتی رات کا —

دن کٹتے گئے راتیں ڈھلتی گئیں — مہینے بیتے گئے — مہینوں نے سال کو جنم دیا اور شاد نے خوبصورت ساجد کو !

ساجد اس کی چھاتی سے چمٹا ہوا تھا، وہ اسے تھپکیاں دے رہی تھیں اس کا چہرہ ممتا کے ساگر میں غوطہ زن تھا — !

" ایک ہی سال میں ہم اتنے غیر ہو گئے کہ اب ہم سے نظر ہی نہیں ملائی جاتی — " میں نے ساجد کو اس کی چھاتی سے الگ کرنے کی کوشش کی — !

" بچوں جیسی حرکتیں ہیں تمہاری — اگر پھر سے رو پڑا تو چپ کرانا مشکل ہو گا — " اس نے میرا ہاتھ جھٹک کر کہا —

ہم دونوں کی کشمکش بڑھی، ساجد نے آنکھیں کھولیں اور رو پڑا —

" لو اب چپ کراؤ — " وہ ناراض ہو کر بولی —

دفعتاً ایک زور کا جھٹکا ہوا — شاید بھونچال تھا —

" دلشاد — " میں پوری قوت سے چیخ پڑا —

کوئی مجھے جھنجھوڑ رہا تھا — میں نے آنکھیں کھولیں تو " مونا لیسا " کی مسکراہٹ نے میرا استقبال کیا —

" آپ شاید کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ رہے تھے — " اس کا لہجہ طنزیہ تھا —

"بھونچال۔" میرے اُلجھے ذہن نے پوچھا۔

"نہیں۔ طیارہ لینڈ کر رہا ہے۔" وہ ہنس پڑی۔

میں نے اپنے حواس یکجا کئے۔ لطیف خواب بکھر چکا تھا۔ وہ برابر مجھے حیرت بھری نظروں سے تک رہی تھی۔

"دلشاد آپ کی مسز ہے کیا۔" اس نے اشتیاق سے پوچھا۔

"نہیں صرف خواب۔" میں نے اس کے دل میں اُترنے کی کوشش کی۔

"کبھی کبھی خواب انسان کی جان بھی لے لیتے ہیں۔" وہ میری آنکھوں میں اُتر آئی۔

"باتوں سے آپ ڈاکٹر لگتی ہیں۔"

"ہاں ڈاکٹر منظورہ اور آپ۔" وہ بولی۔

"جاوید۔ میں ایک کاروباری آدمی ہوں۔"

"لیکن کاروباری آدمی آپ کی طرح خواب تو نہیں دیکھتے، یہ کام تو شاعروں اور ادیبوں کا ہے۔"

"کاروباری آدمی انسان نہیں ہوتے کیا۔؟" میرے لہجے میں درد کی ہلکی سی آمیزش تھی۔

"آپ تو حد درجہ کے جذباتی ہیں، چلئے اس موضوع کو یہیں پر ختم کریں" وہ مجھے میٹھی نظروں سے گھورنے لگی۔ "آپ کتنے دن یہاں ٹھہریں گے۔"

"ہفتہ بھر۔" میرے جذبات پگھلنے لگے۔ "اور آپ۔"

"بتا نہیں سکتی۔" وہ لائیٹ کو رد کر کے بولی۔

"کیوں —؟"

"آپریشن کا معاملہ ہے۔ آج ہو جائے تو دو چار روز کے بعد واپس جاؤں گی۔"

"میں سمجھا نہیں۔" میں نے قدرے بے چین ہو کر پوچھا۔

"مجھے اپنا آپریشن کرانا ہے۔" اُس کے لبوں پر پھر وہی "مونا لیزا" کی مسکراہٹ چھا گئی۔

"اپنا آپریشن — آپ تو اچھی بھلی ہیں۔" میں نے حیرانگی سے کہا۔

"میری بیماری بھی عجیب ہے۔ میں پہلے بھی تین بار اپنا میڈیکل چیک اپ کرانے یہاں آ چکی ہوں۔ وہ رُک رُک کر بول رہی تھی۔" میں اپنے جسم میں عجیب سی تبدیلی محسوس کرتی ہوں۔ پانچ سال پہلے میں نے اس بیماری کو محسوس کیا تھا اور اب ڈاکٹروں کے مشورے کے مطابق میرا آپریشن ہوگا میری جنس تبدیل ہو گی —!"

مجھے ایسا لگا جیسے اس کی آواز طیارہ کے انجن کے شور نے دبوچ لی۔ طیارہ رَن وے پہ دھیرے دھیرے رینگ رہا تھا۔ اور مجھے محسوس ہوا۔ وہ رَن وے پہ کھڑا دوسرے طیارہ کے ساتھ ٹکرا کر پاش پاش ہو رہا ہے —!!

جولائی ۱۹۷۲ء

# چاند کا داغ

پسینے کی بدبو میرے تنفس کے ساتھ رچی بسی ہے۔!

میں اپنے بوجھل وجود کو گھسیٹتا ہوا نہرو پارک سے گھر کی جانب موڑتا ہوں گرمی کی شدت سے میرا بدن جھلس چکا ہے، پسینے سے پاؤں پھول چکے ہیں درد کی ناقابل برداشت ٹیسیں انہیں بے حس کر چکی ہیں اور مجھے ایسا لگتا ہے کہ جیسے وہ جوتے کی سلائی پھاڑ کر باہر آ نکلیں گے!

تھوڑی دور چل کر میں سستانے کے لئے رک جاتا ہوں، پاؤں کی انگلیوں کو اندر ہی اندر سمیٹ لیتا ہوں، انہیں حرکت دیکر کچھ کچھ سکون سا پاتا ہوں اور غیر شعوری طور پر میرے منہ سے، ان تنگ جوتوں کا فیشن ایجاد کرنے والے کے نام کئی صلواتیں نکلتی ہیں۔!

اچانک میری توجہ، ڈل کے سینے پر ابھی ابھی اُبھرے ہوئے روشنی کے ایک تھرکتے ہیولے کی جانب مبذول ہو جاتی ہے۔ میں جونگاہ کا زاویہ بدل کر اوپر نظر اُٹھاتا ہوں تو چاند کو دیکھ کر ایک انجانی سی مسرت سینے میں سر ابھارتی ہے۔! جس نے اپنی زرد روشنی سے رات کی کالی چادر کا رنگ

چاک کر دیا ہے۔ تھوڑی دیر پہلے سیمنٹ کے کھمبوں کی نیلگوں روشنی جو فخر سے سر اٹھائے کھڑی تھی، اب چاند کے نکلتے ہی شرماکر ماند پڑ چکی ہے۔ چاند کی تابناکی ان پر حاوی ہو چکی ہے اور اب یہ سیمنٹ کے کھمبے یونہی بے مقصد استادہ ہیں۔

یہ نظام ایسے ہی چلتا آیا ہے اور یونہی چلتا رہے گا۔! ہر ایک کی روشنی اسی طرح کسی نہ کسی کے سامنے ماند پڑ جاتی ہے، چاند بھی تو، سورج کی پہلی کرن کے ساتھ ہی اپنی تابناکی کھو دیتا ہے۔ یہاں پر ہر ایک کسی نہ کسی پر حاوی ہے۔ یہ تو ازل سے ہوتا آیا ہے، شائید ابد تک ایسے ہی چلتا رہے۔!

میں چاند کو غور سے تکنے لگتا ہوں۔ کالے کالے دھبے، جن سے اس کی تابناکی میں کمی سی آچکی ہے۔ بدنما داغوں نے اسکی خوبصورتی کو ابھرنے نہیں دیا ہے۔

"چاند۔!" میں زیر لب بڑبڑاتا ہوں۔ "کتنا لطیف نام ہے اور کتنا پُراسرار بھی۔!" یہ تو روزِ ازل سے ہی انسان کے لئے ایک معمہ بنا ہوا ہے۔ دُنیا کے بڑے بڑے سائینسدانوں کی مختلف رائیں اور اس کی سطح پر عجیب و غریب مخلوق ہونے کی قیاس آرائیاں۔! "سبھی کچھ تو آج عیاں ہو جائے گا۔

آج کی رات اس کی ساری پُراسراریت سے پردہ سرکانے کے لئے وجود میں آئی، آج جبکہ دو انسان اس کی سطح پر قدم ڈال دیں گے تو صبحِ آفتاب کی کرنیں وہ سارے بھرم کھول دیں گی۔ جن پر اس وقت پردہ پڑا ہوا ہے۔ ساری دُنیا حقیقت سے آشنا ہو جائے گی۔!

اچانک دل کے سینہ میں ہلچل سی مچ جاتی ہے۔ میرے خیالات منتشر ہو جاتے

ہیں۔ ایک موٹر لوٹ ڈل کا سینہ چیرتے ہوئے میرے سامنے ایک زناٹے کے ساتھ گذر جاتا ہے۔ میں کانپ سا جاتا ہوں کیونکہ مجھے ایسا لگتا ہے کہ جیسے اُس روشنی کے تھرکتے ہیولے کو کسی کالے دیو نے نگل لیا ہو۔۔! اُسے پاش پاش کردیا ہو۔۔!! اور پھر بہت سارے کالے دیو اُسکی روشنی چھیننے کے لئے ایک دوسرے پر جھپٹ پڑے ہوں۔ اس روشن ہیولے کی بوٹی بوٹی نوچ ڈالنے کے لئے، ایک دوسرے پر سبقت لے رہے ہوں۔۔! مجھے ایسا گمان گذرتا ہے کہ جیسے نیل آرم سٹرانگ نے چاند کی سطح پر اپنا بائیاں پاؤں ڈالدیا ہو اور دنیا کے سبھی ممالک اپنی اپنی مبارکبادیاں امریکہ جیسے اُس عظیم ملک کو بھیج رہے ہوں جو آج تک کالے، گورے کا مسئلہ حل کرنے میں ناکام رہا ہے۔ جہاں کالے چہروں پر سفید دیو جھپٹتے ہیں۔۔!

دھیرے دھیرے روشنی کے وہ اَن گنت سہمے سہمے نقطے پھر سے اپنی اصلی شکل میں آنے کی کوشش کرتے ہیں اور اپنی رہی سہی روشنی یکجا کرکے پھر سے اُسی روشن ہیولے کی صورت میں تھرکنے لگتے ہیں۔ میں اطمینان کا سانس لیتا ہوں۔

پھر جیسے روشنی کا تھرکتا ہیولا، دُلہن کے رُوپ میں بدل گیا ہو، جو ہانپتی کانپتی کھیتوں کی آڑی ترچھی پگڈنڈیوں پر بھاگی جارہی ہو۔ اُس کے پیچھے بہت سارے کالے دیو اُس پر جھپٹنے کے لئے دوڑ رہے ہوں۔ پھر اُس نے اُن کے ظالم پنجوں سے بچنے کے لئے سرکاری لیمپ [illegible] خیال ہو

اور وہاں پر مجھے دیکھتے ہی میرے سینے سے آ لگی ہو "مجھے ان ظالموں سے بچاؤ۔ وہ میری عزت کو لوٹنے بوڑھے ٹھیکیدار اکبر ڈار ۔۔!" اس کے آگے وہ کانپتا وجود کچھ نہ کہہ پایا۔ وہ کالے دیو میرا سایہ دیکھتے ہی بھاگ چکے ہوں۔ میں نے زون کو تسلی دے کر اپنے ساتھ کر لیا ہو، اس روشن ہیولے کو اپنے حسین تخیل کے ساتھ ملا لیا ہو! اُسے دنیا بھر کے کالے دیوؤں سے بچانے کے لئے زندگی کا ساتھی چن لیا ہو!

میں گھڑی دیکھتا ہوں۔ گیارہ بج چکے۔ میرے قدم تیزی سے گھر کی جانب بڑھنے لگتے ہیں، مجھے اب کسی چیز سے دلچسپی نہیں۔ زون کی باہوں کے لمس کے سوا۔ باقی سارے خیالات تھک کر سو چکے ہیں۔ پاؤں کی وہ ناقابل برداشت ٹیسیں جو تھوڑی دیر پہلے مجھے نڈھال کر چکی تھیں، اب بالکل دب کر رہ گئیں ہیں۔ ڈل کی خوبصورتی زون کا تصور آتے ہی پھیکی پڑ چکی ہے ۔۔! مجھے اب کوئی خیال نہیں، صرف اُس روشن ہیولے کے سوا جس نے میری زندگی کو تابناکی بخشی ہے! یہ چاند بھی اب مجھے پھیکا پھیکا سا لگتا ہے جس کی پُراسراریت آج ختم ہونے والی ہے ۔۔!

اپنی گلی کے نکڑ پر پہنچتے ہی جو غلام قادر کے مکان کی طرف نظر پھیرتا ہوں تو وہ حقہ کے نیچے منہ میں دبائے، کھڑکی میں بیٹھے دھیان سے ریڈیو سے نشر ہونے والی کمنٹری سُن رہا نظر آتا ہے۔ وہ مجھے دیکھ کر ہلکے سے کھانسنے لگتا ہے۔ میں نظریں نیچی کر کے اپنے صحن کا دروازہ کھولتا ہوں۔ ٹائیگر دُم ہلاتا ہوا میرے پیچھے آتا ہے۔ میری ایک ہلکی سی تھپکی لے کر وہ واپس صحن کے کونے میں جا کر اونگھنے لگتا ہے۔ میں اپنے کمرے کے عین مقابل جونہی میرا ہاتھ دروازے کو

کھڑکی کھٹکھٹانے کے لئے اُٹھتا ہے تو سناٹے کو چیرتی ہوئی دو کانپتی سرگوشیاں میرے ہاتھ کو لوہے کی سلاخ کی مانند سخت بنا دیتی ہیں۔!"

"اب کیا ہوگا۔!"

"گھبراؤ نہیں۔ میں کھڑکی سے کود جاؤں گا۔!"

اچانک کسی شئے کی گرنے کی آواز کے ساتھ ہی ٹائیگر جاگ پڑتا ہے اور زور زور سے بھونکنے لگتا ہے۔

میرے کانوں میں وہ کانپتی سرگوشیاں پگھلتا ہوا سیسہ انڈیل چکی ہیں مجھے کچھ سجھائی نہیں دیتا، کانپتے ہوئے روشن ہیولے کے ہاتھ دروازے کے پٹ کھول دیتے ہیں اور پھر روشنی کا وہ سہما ہوا کانپتا ہیولا بستر میں دبک جاتا ہے میں اپنے بستر پر تاریکیوں کے اتھاہ سمندر میں گم کر کنارا پانے کی تدبیریں سوچتا ہوں سُورج کی پہلی کرن ایک نیا پیغام لے آتی ہے "امریکہ نے چاند کی سطح پر اپنا جھنڈا گاڑ دیا" دنیا کے سارے ریڈیو اسٹیشن امریکہ کو اس یادگاری کارنامے پر مبارکبادی کے پیغامات دے رہے ہیں۔

چاند کی پُر اسراریت ختم ہو چکی ہے وہاں چٹانوں اور لق دق صحراؤں کے سوا کچھ بھی نہیں۔ میرا ذہن زمین کی سرسبز وادیوں سے نکل کر چاند کی سطح کی جانب پرواز کرتا ہے۔ لق دق صحرا اور کھردری چٹانیں میرا استقبال کرتی ہیں۔ دُور ایک روشنی کا ہیولا مجھے نظر آتا ہے، میں اسکی طرف بڑھنے لگتا ہوں۔ پھر اچانک روشنی کا وُہ دہکتا ہیولا مجھے اپنی لپیٹ میں لیتا ہے۔ سہم کر میرے منہ سے چیخ نکل جاتی ہے آنکھیں کھولتا ہوں تو زمین کو اپنے [illegible] قریب پاتا ہوں [illegible] قربت سے [illegible] دوسری جانب پہنچا ہوا ہوں جیسے وہ زمین نہ ہو بلکہ امریکہ کے امدادی فنڈ سے ملی ہوئی کوئی خیراتی شئے ہو۔

# درد کے پیوند

.....وہ بے تحاشہ بھاگ رہا ہے جیسے اُس نے تب تک پیچھے نہ مڑ کر دیکھنے کی قسم کھا رکھی ہو۔ جب تک نہ اُن چاروں کے جوتوں کی آوازیں مدھم پڑ جائیں جو بھوکے بھیڑیوں کی طرح اُس کے تعاقب میں لگے ہیں۔!

ڈاکٹر جاوید کی نگاہیں اُن سب کے تعاقب میں ہیں۔ اُس کے چہرے سے بے قراری جھلک رہی ہے، جیسے وُہ اس آدمی کے پکڑے جانے کا منتظر ہو۔

دفعتاً اُسے ٹھوکر لگی۔ وہ لہرا کر تارکول کی چکنی سڑک پر ڈھیر ہو گیا۔ وُہ چاروں اُس پر جھکے لمحہ بھر میں وُہ اُن کے ہاتھوں میں جھول گیا اور اُدھر ڈاکٹر جاوید نے اطمینان کا ایک گہرا سانس لیا.....

---

وُہ جب مرینا میں داخل ہوا تو قدرے سہم گیا۔ اُس کی نگاہیں ایک ایسے شخص پر مذکورہ ہو کے رہ گئیں جیسے وہ لگاتار ایک مہینے سے دیکھتا چلا آرہا تھا۔ وہ آج بھی حسبِ معمول وسکی کے ہلکے ہلکے سپ لے رہا تھا۔ چہرہ پُراسرار۔۔۔

کو اس بوڈھے پر ل۔ جس پہ آ کر نگاہ ٹک جاتی تو بھول بھلیوں میں کھو جاتی ۔ صرف کئی ایک سوالیہ نشان لے کر واپس لوٹتی ۔۔۔!

کون ہے یہ ۔۔۔؟

کہاں سے آیا ہے ۔۔۔؟

اس کی آنکھوں میں غیر معمولی چمک کیوں ۔۔۔؟

اُس نے ایک جھرجھری لی۔ وہ سارے سوالیہ نشان ذہنی دریچے پھلانگ کر مرینا کی الکوحل فضا میں جا تحلیل ہوئے ۔ خالی الذہن وہ کاؤنٹر کی طرف بڑھا۔ ہال کا ایک بھرپور جائزہ اُسے ایسا کرنے پر مجبور کر چکا تھا۔ سارے ٹیبل بھر چکے تھے۔ کہیں پر بھی کوئی کرسی خالی نہ تھی۔ ماسوائے اُس ٹیبل کے جہاں پر وہ پُراسرار شخص وسکی کے ہلکے سِپ لے رہا تھا۔

کاؤنٹر کے قریب ایک خالی کرسی پر جم کر، خالی گلاس پر اُس کی گرفت مضبوط ہوتی گئی۔ "بھئی پرکاش ۔ پلاؤ ۔۔۔"

رم کے تلخ گھونٹ حلق سے اُترتے ہی وہ سارے سوالیہ نشان پھر سے اُس کے ذہن میں جا گھسے۔ "پرکاش لگتا ہے وہ کوئی غیر ملکی جاسوس ہے۔ پُراسرار شخص کی طرف اشارہ کر کے اس نے ہوائی اڑائی۔

"بھئی ہوا کرے ۔" پرکاش کا لہجہ تلخی سے پُر تھا، جیسے کسی نے زبردستی اُن کے حلق میں رم کی پوری بوتل انڈیل دی ہو، پھر بھی اُس نے اپنے چہرے سے ایسے سارے جذبات مٹانے کی بھرپور کوشش کی جو اس کے

خائف ہونے کی غمازی کر رہے تھے۔

"میں نے یہاں تک سنا ہے کہ وہ کمیونسٹ ہے۔!" ڈاکٹر جاوید نے ایک اور لقمہ دیا۔ ایسا اس نے اسے چڑانے کی غرض سے کیا تھا۔ اسے علم تھا کہ پرکاش کو کمیونسٹوں سے حد درجے کی چڑ تھی اس کے کئی گاہک کمیونسٹ تھے جو صرف ادھار یا مفت پینا چاہتے تھے اسے ایسے مفت خوروں سے سخت نفرت تھی جن کی رال دوسروں کے لبالب بھرے پیالوں کو دیکھتے ہی ٹپکنے لگتی۔

"کمیونسٹ ہو یا سوشلسٹ۔" وہ بھن گیا۔ "ہمیں تو بل سے غرض ہے جس دن اس نے کمیونسٹی دکھائی اس روز منہ لگوں گا۔!"

"تو ظاہر ہے۔ تم اس سے خائف ہو۔!"

ڈاکٹر جاوید نے اس کی دکھتی رگ پکڑ لی۔ دراصل جو پھبتی اس نے اس پر کسی تھی وہ اس پر بھی صادق آسکتی تھی، اس پراسرار شخص کی آنکھوں میں کوڑیالے سانپ کی سی چمک تھی جسے دیکھ کر ہر کوئی بھی مرعوب ہو سکتا تھا۔

"اور وہ تم سے ڈرتا ہے۔ کیوں۔؟" پرکاش کے لہجے میں بھلا کا طنز تھا۔ "اگر اتنے ہی دم خم ہیں تو اس کے سامنے جاؤ۔ بات کرو۔ تب میں مانوں۔!"

"تو پھر بلاؤ ہاتھ۔!" ڈاکٹر جاوید نے ترنگ میں آکر کہا۔ "اگر میں جیتا تو آج جتنا بھی پیوں گا۔ اس کا بل نہیں چکاؤں گا۔ بولو منظور۔!"

منظور۔! پرکاش کا ہاتھ بھی غیر ارادی طور پر آگے بڑھا یا شاید اسے یقین رہا ہو کہ جاوید شرط ہار جائے گا۔

رم کے چار پگ چڑھا کر اُس نے اپنے آپ کو اُس میز پر جانے کے لئے تیار کیا۔ یہ اُس کا اپنا تجسس تھا جس نے اسے شرط لگانے پر اکسایا تھا۔

کانپتے قدموں کو سنبھالتے وہ اُس میز تک پہونچنے میں کامیاب ہو ہی گیا پُراسرار شخص کی گرفت گلاس پر جمی ہوئی تھی حالانکہ اب وہ خالی ہو چکا تھا۔ جب کافی دیر تک اُس کی محویت نہ ٹوٹی تو ڈاکٹر جاوید ہلکے سے کھنکارا۔

" اور منگواؤں مسٹر...." ڈرتے ڈرتے اُس نے چند بے ربط الفاظ کا سہارا لیا تھا۔

پہلی بار دونوں کی نگاہیں ملیں ڈاکٹر جاوید کو ایسا لگا جیسے ان نگاہوں کی تیز آنچ سے اُس کا وجود پگھل رہا ہو۔ ان کی تاب نہ لاکر اُس نے نظریں جھکا لیں

" مجھے ڈاکٹر جاوید کہتے ہیں۔ میں یہاں کے لیرسی ہسپتال میں تعینات ہوں" اُس نے نیچی نگاہوں سے ہی اپنا تعارف کرا لیا۔

" لیرسی ہسپتال۔" تلخی سے پر لہجے میں وہ بڑبڑایا اور ایک طویل سانس چھوڑ کر نگاہیں مرکری ٹیوب لائیٹ پر گاڑ دیں۔ جیسے اس روشنی کے سہارے وہ ماضی میں جھانکنے کی کوشش کر رہا ہو۔ چہرہ رنگ بدلتا گیا۔ زندگی سے یکسر عاری اور پھیکے رنگ۔ جیسے مایوسیوں کا برش اُس کے چہرے پر پھیر دیا گیا ہو۔! ڈاکٹر جاوید کو اُس کا چہرہ ایک پکا پھوڑا لگا جس کو بس ہلکا سا PRICK دینے کی ضرورت تھی اور پیپ خود بخود رسنے لگتا۔!

"آپ کہاں کھو گئے۔" اُس نے اُسے مایوسیوں کی عمیق گہرائیوں سے نکالنے کی سعی کی۔

"اچھا —!" جیسے کسی نے اُسے بھیانک خواب دیکھتے ہوئے اچانک جھنجھوڑ دیا ہو۔

"میں نے کہا — کہاں کھو گئے آپ —!"

"اس مرکری ٹیوب لائٹ میں اپنی زندگی ڈھونڈ رہا ہوں —" فلسفیانہ لہجے میں بڑا ہی کرب تھا —!

"کچھ پہیلی سی لگتی ہے — مرکری ٹیوب لائٹ اور زندگی —"

"ہاں میری زندگی — بس ایسی ہی دمک تھی اُس کے چہرے میں —!"

"کس کے چہرے میں —؟"

"چھوڑو ڈاکٹر — جب کارواں ہی لُٹ چکا ہو تو منزل کا تذکرہ کیوں؟"

اُس کے چہرے پر تاریکیوں نے پڑاؤ ڈالے۔

"کیا اُس نے تمہارا ساتھ چھوڑ دیا۔" ڈاکٹر جاوید نے بیقراری کے عالم میں پوچھا۔

"نہیں ڈاکٹر — اُسے کوڑھ نے مجھ سے چھین لیا۔ پری ہسپتال میں کام کرتے ہو اس لئے خوب سمجھ گئے ہو گے کیسی بیماری ہے —!"

اُس کی آواز میں بلا کا درد تھا۔

"تو کیا آپ نے اُسے ...." ڈاکٹر جاوید کو جملہ اُدھورا چھوڑنا پڑا کیونکہ وہ ہزیانی انداز میں چیخ پڑا تھا۔

"نہیں ڈاکٹر — وہ مجھے چھوڑ کر کہیں چلی گئی — میں اُسے تلاش کرتا

کرتے تھک گیا۔ کہیں چلی گئی دیس دیس گھوما — پر وہ نہ ملی —!"

"شاید ہمارے لیرسی ہسپتال میں ملے —!"

"نہیں ڈاکٹر — وہ اب کہیں پر نہ ملے گی —!"

تو پھر اب آپ اپنی زندگی برباد کرنے پر کیوں تلے ہو۔ وہ تو ملنے سے رہی پھر تلاش سے کیا حاصل —!"

"میں اب اسے نہیں، بلکہ اُس مرض کی تلاش میں ہوں جس نے اُسے مجھ سے چھین لیا۔ صرف یہی تمنا ہے کسی طرح مجھے بھی وہ مرض آ دبوچے کم از کم میری بیقرار روح اس کی پیاسی روح سے جا ملے —!" اُسکی آنکھوں سے آنسوؤں کے دو موٹے موٹے قطرے بہہ کر ٹیبل پر پھیل گئے۔

ڈاکٹر جاوید کی آنکھوں کے سامنے اپنے ہسپتال کا نقشہ گھومنے لگا۔ خوبصورت اور معصوم چہرے، جنہیں ایک موذی مرض نے بگاڑ کے رکھ دیا تھا۔ جن کی زندگی بے معنی تھی۔ جو اپنے وجود کو دھرتی کا ایک بوجھ تصور کرتے تھے جن کی کوئی منزل نہیں۔ جو موت کے انتظار میں آسمان کی طرف نظریں ٹکائے رہتے تھے۔ موت جو اُن کے لئے زندگی تھی

---

تین چار اخباری تراشوں سے منسلک محکمہ صحت عامہ کے سربراہ کی چٹھی نے لیرسی ہسپتال میں کھلبلی مچا دی تھی اور اخباری تراشوں میں محکمے کے سربراہ کو نا اہل اور فرض ناشناس جیسے الفاظ سے نوازا

گیا ہے۔ شہر کے پارونق بازاروں پر کوڑھی بھکاریوں کی بڑھتی ہوئی تعداد پر گہری تشویش کا اظہار کیا گیا ہے۔ اسی لئے محکمہ کے سربراہ نے ڈاکٹر جاوید کو اس جانب فوری توجہ دینے کے لئے لکھا ہے اور وہ عملے کے چند افراد کے ہمراہ سرکاری وین لے کر نکل پڑا ہے۔

پرسی ہسپتال کی وین تین کوڑھی بھکاریوں کو اپنے اندر سما کر مولانا آزاد روڈ پر پوری رفتار سے جا رہی ہے۔ بڈشاہ پل کے قریب اچانک بریک چیخ پڑتے ہیں۔ وین رک گئی ہے۔ چار خدمتگار پیچھے سے اتر چکے ہیں اور فرنٹ سیٹ پر ڈاکٹر جاوید کے ہاتھ کے اشارے پر اس ہٹے کٹے کوڑھی بھکاری کو پکڑنے کے لئے دوڑ پڑے ہیں جو پل کے عین بیچ ایک پھٹا پرانا کمبل اوڑھے بیٹھا ہے۔ اس کے بے ترتیبی سے بڑھے ہوئے بال گرد سے اٹے ہوئے ہیں۔ ہاتھوں میں بندھی ہوئی سفید بینڈیج پر سرخ خون کے داغ اس کے مرض کی نشاندہی کر رہے ہیں۔

انہیں اپنی جانب آتے دیکھ کر اس نے وہ پھٹی پرانی کمبل دور پھینک دی ہے اور بھاگنا شروع کر دیا ہے۔

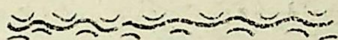
"نہیں۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔" ڈاکٹر جاوید اس ہٹے کٹے بیہوش کوڑھی کو دیکھ کر چیخ پڑا۔ چاروں خدمتگار جو اسے اٹھا کر لائے ہیں حیرت کے عالم میں ڈاکٹر کی طرف دیکھ رہے ہیں۔

"اس کے ہاتھوں کے بنڈیج کھول دو۔" اپنے جذبات پر قابو پا کر اس نے

تھکا نہ انداز میں اُن سے کہا۔ ہاتھوں کے بند ٹیج کھل چکے ہیں۔ صاف و شفاف ہاتھوں پر مرض کی کوئی علامت نہ دیکھ کر وہ ایک ساتھ مارے حسرت کے چیخ پڑے ہیں۔

اِس دوران وہ ہوش میں آ چکا ہے۔ اپنے اِرد گرد اِن چار افراد کو دیکھ کر جو اسے پکڑنے کے لئے دوڑے تھے، نفرت سے زمین پر تھوک دیا ہے لیکن ڈاکٹر جاوید کے چہرے پر نظر پڑتے ہی اس نے وحشیانہ انداز میں قہقہے لگانے شروع کر دیئے ہیں۔

"ڈاکٹر — مجھے منزل کا راستہ دکھاؤ" قہقہے آہستہ آہستہ ہچکیوں میں بدل چکے ہیں، وہ دوبارہ بیہوش ہو چکا ہے اور اُدھر دُور مغرب میں آفتاب کا سنہری تھالی پہاڑوں کے پیچھے چھپنے کی کوشش میں لگی ہے — !!!



# دکھ اور سپنے

## شلی!

یہ نام ہے اُس موڑ کا جہاں بچپن جوانی کے گلے ملتا ہے۔ میانہ قد، گندمی رنگت، بڑی بڑی گہری سیاہ آنکھیں، ستواں ناک۔ خدوخال دلکش نہیں پُرکشش ضرور ہیں، ان سب خصوصیات کا مرکب ایک نام ہے اور وہ ہے شلی!

اس نام کے ساتھ جانے کیوں میرا دل دھڑکنے لگتا ہے۔ عجیب سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ جیسے یہ کسی لڑکی کا نام نہ ہو، ایک ہرا کچا آم ہو، جسے دیکھ کر ہی منہ میں پانی کے چشمے اُبل پڑتے ہیں۔!

شلی کو میں صدیوں سے جانتا ہوں۔ اُس سے میری ملاقات آدم کے زمانے میں ہوئی تھی اور تب سے اب تک ہم دونوں ہر دور میں آتے رہے ملتے رہے، میں اُسے چاہتا رہا اور وہ مجھ سے دُور بھاگتی رہی۔ ہمارا ابدی ملن نہ ہو سکا۔ میں ترستا رہا اور وہ تڑپاتی رہی۔ میں اُسے حاصل کرنے کے لئے اپنی ہستی مٹاتا رہا اور وہ مجھ سے بچتی بچاتی اپنی ہستی مٹاتی رہی۔

"شلّی۔!" میں اسے پکارتا ہوں۔ "ہمارا ملن کب ہوگا۔!"

"جب دنیا نہ رہے گی۔" جذبات سے عاری چہرہ کے لب ہلتے ہیں۔

"ایسا کب ہوگا۔" میں بیقراری سے کہتا ہوں۔

"کیا قیامت پر یقین نہیں۔" سپاٹ چہرہ کے لب دوبارہ ہلتے ہیں۔

"قیامت کب آئے گی۔" میں دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیتا ہوں۔

"جب ہمارا ملن ہوگا۔" وہ جواب دیتی ہے۔

قیامت اور ملن۔ ملن اور قیامت میں پھر انہی بھول بھلیوں میں بھٹک جاتا ہوں۔ گھپ اندھیرے مجھے اپنے آنچل میں لیتے ہیں۔ ایسے میں بھلا کوئی منزل کے نشان پا سکتا ہے۔؟ میں چلتا ہوں۔ آگے بڑھتا ہوں۔ پھر میرا وجود موم کے اندر پگھلنے لگتا ہے، میری ہستی انہی بھول بھلیوں میں فنا ہو پاتی ہے۔ گھپ اندھیروں کے نگہبان، میرے پگھلتے ہوئے وجود کو ایک نئے سانچے میں ڈھال لیتے ہیں اور اُجالوں کی جانب پھینک آتے ہیں۔

"مجھے اس اُجالے میں نہ پھینکو۔" میں تاریکی کے نگہبانوں کے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں۔

"یہی تمہاری منزل ہے۔" وہ سبھی ایک ساتھ بول پڑتے ہیں۔

"لیکن شلّی۔!"

"وہ وہاں تمہارے انتظار میں بیٹھی ہے۔" وہ دُور روشنی سے نہائے ہوئے ایک محل کی جانب اشارہ کرتے ہیں۔

"ہمارا ملن تو قیامت کے روز ہوگا۔ تب تک میں کیا کروں۔"

"ہمارا کام تمہیں یہاں تک پہنچانا ہے۔ آگے جو جی میں آئے کرو۔" وہ مجھے اس روشنی کے سمندر میں پھینک کر اُلٹے قدموں واپس اندھیروں میں گم ہو جاتے ہیں۔

میں رینگتے رینگتے اس سمندر کے وسط میں پہنچ جاتا ہوں۔

میں وہاں پہنچ کر دم لیتا ہوں، جہاں زندگی ایک جیٹ طیارے کے مانند اُڑتی ہے۔

جیٹ طیارے ـــ آواز سے تیز رفتار! وہ رفتار جو زندگیوں کو کچلتی، گھسیٹتی ہوئی لے جا رہی ہے ـــ!

میں گھٹن محسوس کرتا ہوں، واپس گھپ اندھیروں کی جانب لوٹنا چاہتا ہوں

ـــ شلی، ایک موہوم اُمید کے سہارے میں آگے بڑھتا ہوں۔ اُسے اپنانے کے لئے ـــ قیامت لانے کے لئے ـــ!

"شلی ـــ!"

"ہُوں ـــ"

"کیا اب بھی کچھ وقت باقی ہے۔"

"ہاں ـ"

"اب انتظار کرنے کی ہمت میں سکت نہیں۔"

"سکت کا اس ATOMIC دَور میں کیا کام ـــ!"

تھا کچھ نہ سمجھتے ہوئے بے وقوفوں کی طرح اس کا منہ تکنے لگتا ہوں،
اُس کے موتیوں سے سپید دانت لبوں کی حصار توڑ کر باہر آتے ہیں،
وہ میری معصومیت پر کھلکھلا کر ہنس پڑتی ہے۔
" اتنا بھی نہیں سمجھے۔ انسان کی سکت اب ایٹم اور ہائیڈروجن بم
میں سما چکی ہے۔!
" تم ابھی وہی بابا آدم کی باتیں لے بیٹھے ہو۔" وہ مجھے سمجھانے لگتی ہے۔
" مجھے ایسی سکت نہیں چاہیے جو ساری دنیا سے سکت چھینے۔!" میں
بیقرار ہو اُٹھتا ہوں۔
"لیکن دنیا یہی چاہتی ہے۔"
" دنیا کیوں ایسا چاہتی ہے۔" ؟
" تاکہ قیامت آئے۔"
" قیامت۔!
" ہاں قیامت۔ ہمارا ملن۔!" پہلی بار اُس کا چہرہ مجھے جذبات
سے پُر دکھائی پڑتا ہے۔
پھر چاروں طرف گھپ اندھیرا چھا جاتا ہے۔ دھول اُڑ رہی ہے۔
جسم اُڑ رہے ہیں۔ اندھیروں کے نگہبان شَشّی کو اُٹھائے لے جا رہے ہیں۔
میں چیخنے لگتا ہوں۔" شَشّی۔!"
مگر آواز حلق کے اندر ہی دم توڑتی ہے۔ صرف اندھیروں کی

دھم آوازیں میرے کانوں سے ٹکرا رہی ہیں ۔ " دنیا میں شلی کا کوئی سچا پرستار نہیں ہے ۔ !"

" لیکن میں ۔ !" میری آواز حلق سے باہر آنے کے لئے زور لگا رہی ہے

" تمہارے چاہنے سے کیا ہوتا ہے ۔ تم اکیلے اسے حاصل کر کے کیا کر سکتے تھے ۔ " وہی اندھیروں کی آوازیں ۔

وہ میری نظروں سے دور کر لی گئی ہے ۔

" شلی ۔ !" میں پوری قوت سے چیخ پڑتا ہوں ۔

...... میں ہڑبڑا کر بستر سے اٹھ بیٹھتا ہوں ۔ میرا سارا بدن پسینے میں نہا چکا ہے ۔

اُف کس قدر بھیانک خواب ۔ لیکن وہ کون تھی ۔ ؟

شلی ۔ کتنا خوبصورت نام ہے !

ذہن پر سے خواب کے اثرات زائل کرنے کے لئے میں ریڈیو آن کرتا ہوں ... آج ڈیڑھ سو امریکی بمباروں نے شمالی ویت نام کے اہم فوجی ٹھکانوں پر تقریباً پانچسو کامیاب حملے کئے ، ویت نام کی جنگی تاریخ میں اب تک امریکی بمباروں نے کبھی بھی ایسے کامیاب حملے نہیں کئے .....

میں ریڈیو آف کر کے سوچنے لگتا ہوں ۔ " کیا قیامت قریب ہے ۔ !"

" لیکن ۔ شلی ۔ !

کون ہے وہ ۔ کہاں ہے وہ ۔ !!!

# سوچوں کی یلغار

.... ہلکا سا ارتعاش طوفان کی شکل دھارتا ہے۔ خونخوار لہریں سر سے ماتھے پہ تن جاتی ہیں جن پہ انسان تنکے کی طرح ڈوبنے ابھرنے لگتا ہے اور ساحل تک پہنچنے کے لئے تگ و دو کرتا ہے۔ لیکن اس سمندر کا کوئی ساحل نہیں، کوئی جزیرہ نہیں، جہاں پل بھر کا اطمینان کا سانس لیا جا سکے منزل کا صحیح تعین کیا جا سکے۔ یہ سوچیں ہیں! جو انسان کو بہا لے جاتی ہیں۔ بہت دور۔! اور جب یہ دم توڑتی ہیں۔ طوفان تھم جاتا ہے۔ ذہن کے کینوس کے سارے رنگ دھل جاتے ہیں۔ اس پر کوئی نقش نہیں رہتا تب ہاتھ خود بخود برش کی طرف بڑھتا ہے اور برش کورے کینوس کو زندگی بخشنے والے رنگوں کا انتخاب کرنے لگ جاتا ہے...

---

محترم تسلیم!

نیشنل آرٹ گیلری میں آپ کے "سوچوں کی یلغار" نے حد درجہ متاثر کیا۔ ذہن میں ہلچل مچادی، آپ کی اس دلکش پینٹنگ نے اپنے سے ار

دیکھا ہے تب سے سوچوں کے بھنور میں پھنسی ہوئی ہوں، نکل بھاگنے کی سعی خواب کے مترادف لگتی ہے۔

خدا کرے وہ نقاش برش سے کھیلتے رہے جس نے سوچوں کو زندگی بخشی ہے۔ کینوس کو شاہکار کا روپ دیا ہے۔

بس میری دعا یہی ہے اگر قبول ہو گئی تو سمجھوں گی مجھے سب کچھ مل گیا — !

(فن کی پجارن — افروز گل)

---

محترمہ آداب نیاز!

"سوچوں کی یلغار" میں ایسی کوئی خوبی نہیں جو کسی کو راغب کر سکے، منتشر سوچوں کو کینوس پر اتارنا، بھلا یہ بھی کوئی کارنامہ ہوا۔

میں یہ نہیں کہوں گا — آپ غلط بیانی سے کام لے رہی ہیں۔ ہاں اتنا ضرور کہہ سکتی ہوں، یہ زیادتی ہے — ! پھر بھی مجھے آپ کے خیالات کی قدر ہے

سوچوں کا تعلق زندگی سے ہے، جس زندگی میں تڑپ ہو اس کی سوچوں میں تڑپ ہونا ایک قدرتی امر ہے۔ برش کی ہلکی سی جنبش زندگی پر سبقت لے جائے، یہ ناممکن ہے — ! ہاں اگر آڑی ترچھی لکیروں کا نام فن مصوری ہے، تو بلاشبہ میں مصور ہوں — !

آپ کی دعا قابل قبول نہیں کچھ اور مانگا ہوتا تو شاید دینے والا فراخدلی سے کام لیتا!

(خاک بسر — بیاں نثار)

—— (اپنے نمائندے سے) مصوری کے قومی مقابلے میں "سوچوں کی یلغار" نے میدان مار لیا۔ اس دلکش پینٹنگ کے خالق جانثار کو پانچ ہزار روپوں کے انعام کے علاوہ اعزازی سند کا حقدار قرار دیا گیا۔ لیکن تقسیم انعامات کی تقریب پر مصور موصوف کی غیر حاضری نے کئی شکوک کو جنم دیا۔ ہمارا نمائندہ ان کی ایک تصویر حاصل کرنے میں کامیاب ہوا ہے۔ جسے قارئین کی دلچسپی کے لئے ہم اس خبر کے ساتھ دے رہے ہیں ۔

(ایک اخباری خبر)

---

محترم سلام و نیاز!

"سوچوں کی یلغار" کے خدا سے پہلی مرتبہ مخاطب ہو رہی تھی۔!
اس لئے قلم کانپ رہا ہے۔

آپ کی اس دل فریب پینٹنگ کی ہر لکیر کو پڑھا۔ یقین مانئے جتنا اُن پر غور کیا: اپنی زندگی پر کیا ہوگا میں تو آپ کو "سوچوں کی یلغار" کی طرح پُراسرار سمجھ رہی تھی میرا خیال تھا۔ آپ کے چہرے پر اتنی ہی جھریاں ہوں گی جتنی لکیریں اس پینٹنگ میں ہیں! لیکن وہ تصوری شبیہہ اس وقت بری طرح مسخ ہوئی جب اخبار میں آپ کی خوبصورت تصویر دیکھی۔ آپ تو اپنی تخلیق سے بالکل مختلف نکلے خدا کرے آپ کے چہرے کی خوبصورتی آپ کی تصویروں میں بھی گھل جائے، اُن میں تلخیاں نہ ہوں۔ "سوچوں کی یلغار" کی طرح۔!

(آپ کی —— اگر اس لائق سمجھو —! عائشہ سعید)

محترمہ خلوص و آداب!

خوبصورتی ناپائیدار ہے۔ اس چیز کو حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے جو تاابد رہے۔ تصویروں کا روشن پہلو تو ہر کوئی دیکھتا ہے۔ تصویر کے پیچھے کیا کچھ ہوتا ہے اس پر کوئی غور نہیں کرتا۔!

"سوچوں کی یلغار" کے خدا کو اگر آپ غور سے دیکھیں تو آٹھ سالہ کربناک ماضی کے گہرے نقوش ضرور نظر آتے۔!

"سوچوں کی یلغار" میرے اس ماضی کا ہلکا سا عکس ہے جس کا ہر رنگ تلخیوں سے پُر ہے۔

آپ چاہتی ہیں میرے چہرے ایسی خوبصورتی میری تخلیقات میں بھی گھل جائے ایسا ہونا ناممکن ہے۔!

(خاکسار۔ جانثار)

"سوچوں کی یلغار" نے زخموں کے دہانے کھول دیئے۔ پیپ پھر سے رسنے لگا۔ زخمی وجود زخمی رُوح کے گلے مل کر آنسو بہا رہا ہے۔ جنوں ہر حد پھلانگ کر اپنی ساری تخلیقات کو نذرِ آتش کرنے پر تُل جاتا ہے۔ سارے رنگ، برشیں اور کورے کینوس پھینکنے دوڑتا ہے۔

لیکن نہیں۔ میرا تخلیق کار کیا سوچے گا۔ میں بھی تو اس کا شاہکار ہوں۔ ادھورا ہی سہی۔ خوبصورت چہرہ لیکن داہنا بازو ناکارہ، کیسی تخلیق ہوں میں اسکی۔ بائیں ہاتھ سے اس کی دنیا کے رنگوں سے کھیلتا ہوں

کورے کینوس اسی ہاتھ سے زندگی پلتے ہیں۔!

(جانثار کی ڈائری کا ایک ورق)۔

.... اس نے اپنی جلتی آنکھوں پر پلکوں کے دبیز پردے گرا دیئے رات کی سیاہی دھیرے دھیرے چھٹ رہی تھی اور اس کی نئی تخلیق مکمل ہو چکی تھی۔

وہ اب سونا چاہتا تھا۔ مصوری کے قومی مقابلے کے لئے اس نے یہ تصویر سوچوں کے گہرے ساگر میں ڈوب کر نکالی تھی۔

اس نے آنکھیں کھول کر پھر تصویر کو غور سے دیکھا۔ کہیں کوئی کسر رہ گئی ہو، تصویر پر نظریں جما کر وہ سوچنے لگا۔ کیا عنوان ہو سکتا ہے ایک مصور داہنا بازو دکھا ہوا تپائی پر ان گنت رنگ اور برش، سامنے ایزل پر ایک سفید کینوس اور پس منظر میں قدرت کے کئی شاہکار —— حسین دوشیزائیں۔ جنہیں وہ مصور کینوس پر اتارنا چاہتا ہے لیکن! سوچیں نہ جانے کہاں چلی گئیں اور وہ نیند کی باہوں میں جھول گیا —!!!

[date, illegible] ۱۹۷۲ء

# لفظوں کی صلیب

میں ایک خط ہوں ۔!

ایک ایسا خط جو ایک ڈرپوک ادیب کی ذہنی پریشانیوں کا آبگینہ ہے ۔میرا تخلیق کار بدقسمتی سے ایک ایسا کلرک بھی ہے جو دن بھر فائیلوں کی گرد جھاڑ کر شام کو روکھی سوکھی کھا کر افسانے لکھنے بیٹھ جاتا ہے۔ میں حیران ہوں وہ عشق و محبت کے افسانے کیونکر گھڑتا ہے جبکہ وہ کسی لڑکی سے بات کرنے سے بھی ہچکچاتا ہے اور اگر جیسے تیسے بات کر بھی لے تو لال ٹماٹر ہو جاتا ہے

مجھے اپنے خالق سے شکایت ہے تو صرف اتنی کہ میری رگ رگ میں بے ترتیبی کیوں۔ الجھاؤ کیوں ۔؟ بے ربط سے جملے جو بیچ بیچ میں قلم کی نوک سے قتل کئے گئے ہیں میرے بدن پر چابک کے نشانات کی طرح واضح ہیں ۔مجھے اپنے ان ناکارہ عضوؤں کو دیکھ کر گھن آتی ہے، میرے بہت بگاڑنے کے باوجود بھی مجھے اُس سے نفرت نہیں، بلکہ ہمدردی ہے، مجھے جنم دے کر اُس نے اپنے ہی پیروں پر کلہاڑی دے ماری۔ اُس کے

کریکٹر رول پر ایک ایسا دھبہ لگ چکا ہے جس نے پورے پانچ سال تک کے لئے اس کی ترقی رکوا دی، ہے نا یہ اسکی زندگی کا سب سے بڑا المیہ!

میں بہت بھٹک گیا۔ دراصل اس کہانی کی شروعات یہاں سے ہونی تھی

سلیم ایک ادنیٰ درجے کا سرکاری ملازم ہے۔ ۲۶ سال کا دُبلا جوان، سارس کی سی ٹانگیں، لمبے اور اُلجھے بال، جن میں بھولے سے بھی کبھی تیل کی ایک بوند نہ گری ہو گی چہرے پر بس دو خوبصورت آنکھیں ہی ہیں جن میں ہمیشہ شرم کے الاؤ جلتے رہتے ہیں۔ لڑکیوں کا سامنا ہوتے ہی اس کے پسینے چھوٹ جاتے ہیں۔ کافی ذہین ہے۔ لیکن کسی نے آج تک پرکھا نہیں۔ کم گو ہونے کی وجہ سے اپنے باس کی نظر میں وہ نااہل ہے۔

پچھلے مہینے کی بات ہے۔

ایک نئی ٹائپسٹ ممتاز اپوئنٹ ہوئی اور دفتر پر بہار بن کے چھا گئی۔ ہیڈ کلرک رام لال سے لیکر قادر بھنگی تک اسے من ہی من میں چاہنے لگے۔ نزدیک رہنے کی کوششیں کرتے رہے، بات کرنے کے مواقع تلاش کرتے رہے، ممتاز روز ایک شوخ ہرنی کی طرح چوکڑیاں بھرتی دفتر آتی اور ہر دل کو بے قراری بخش کے چلی جاتی۔!

ہیڈ کلرک کے کمرے میں وہ سلیم کے مقابل والے ٹیبل پر ٹائپ رائٹر سنبھالے بیٹھی تھی۔ جب کبھی اچانک سلیم کی نظریں اس سے ٹکراتیں تو وہ کنوارے شخص کی طرف [illegible] ممتاز

کی ٹائپنگ سپیڈ سے بھی آگے بھاگتی۔ سوچوں کے ساتھ وہ بہت دُور نکل آتا۔ اس کے ساتھ گھومنے نکل جاتا، خوب جی بھر کے باتیں کرتا، اُسے چھیڑتا۔ اور جب وہ سوچوں کے گہرے ساگر کی لہروں کی زد سے نکل کر ساحل پہ پہنچتا تو ایک سرد آہ بھر کر دوبارہ فائیلوں میں کھو جاتا۔ ان کا ڈسپوزل کرنے لگ جاتا۔!

اس کے ہاتھوں آج تک سینکڑوں کیس پایۂ تکمیل تک پہنچے تھے، کئی پیچیدہ کیس سلجھ چکے تھے۔ لیکن اپنی زندگی کا کیس جوں کا توں تھا۔ اس کا ڈسپوزل کیسے ہو وہ اُسے نہیں سوجھتا تھا۔ دل اور دماغ اُسے دیر سے ڈکٹیٹ کر چکے تھے۔ اس کیس کی کڑیاں ممتاز ہی ملا سکتی تھی جس سے بات کرنا سلیم جیسے آدمی کے لئے مشکل تھا۔ دل سے ہاتھوں مجبور ہو کر آخر اس نے مجھے جنم دے ہی دیا۔ کیونکہ دل کے نزدیک کیس کے ڈسپوزل کا واحد راستہ یہی تھا۔

میری شکل و صورت مسخ کرنے میں اُس کے دماغ کا بڑا دخل رہا۔ اس کا دل مجھے نگینے کی طرح تراشنا چاہتا تھا۔ اپنے سارے ارمان مجھ میں سمو دینا چاہتا تھا۔ لیکن دل اور دماغ کی سرد جنگ کی وجہ سے میرے عضو پوری طرح نشو و نما بھی نہ پا سکے۔ میرا ناکارہ وجود سلیم کے ذہنی خلفشار کا عکاس بنا!

تین دنوں تک میں اُس کے میز کی دراز میں پڑا۔ اس کی بزدلی پر ماتم کرتا رہا۔ ایک بار اس نے ممتاز کی غیر حاضری میں مجھے اُس کے ٹائپ رائٹر

کے نیچے رکھ بھی دیا لیکن پھر کچھ سوچ کر واپس اپنے میز کی دراز میں لا پٹک دیا۔
اُس روز بد قسمتی سے وہ رخصت پر تھا۔ ایک اوریا نو نے اُس کا
ٹیبل سنبھال کے اچانک مجھے اپنے قبضے میں کیا اور میں ایک غلط ہاتھ میں
پڑنے کے کھسیانا سا ہوا۔ سینئر ہونے کے ناطے سلیم اُس کی راہ کا پتھر تھا۔
دفتر میں ایک ہی اپر کلرک کی جگہ خالی تھی جو ہر حالت میں سلیم کو ہی ملنا تھی۔
باقی جونیئر کلرک اُسے کسی طرح اپنے راستے سے ہٹانا چاہتے تھے۔ آج
ان کی راہ کا پتھر خود بخود لڑھکتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ سلیم کے کیریکٹر رول پر
لگنے والا سیاہی کا دھبہ مجھ پر قبضہ جمانے والے کو پروموشن دلا سکتا ہے۔
اُس نے مجھے حفاظت کے ساتھ اپنی جیب میں رکھ کر مستقبل کے تانے بانے
ملانے کی پہل کی۔!

= دوسرے روز دفتر میں عجیب سی کھسر پھسر ہو رہی تھی۔ سارے
بابو ہیڈ کلرک کے کمرے میں کسی معاملے پر تبصرہ کر رہے تھے۔ ہنسی کے فوارے
چھوٹ رہے تھے۔ سلیم اور ممتاز کی کرسیاں خالی پڑی تھیں۔ سلیم آج
پھر نصف یوم کی رخصت پر تھا۔ اور ممتاز باس کے کمرے میں۔ سلیم جب
ایک بجے کے قریب دفتر پہنچا تو سارے بابوؤں کو اپنے کمرے میں کھسر پھسر
کرتے دیکھ کر حیران ہوا۔ اُسے آتا دیکھ کر سبھوں کو جیسے سانپ سونگھ
گیا اور وہ دھیرے دھیرے کھسکنے لگے۔ ابھی وہ اپنی کرسی پر ٹھیک طرح
سے بیٹھا بھی نہ تھا کہ چپراسی نے باس کا حکم سنا دیا۔

"صاحب آپ کو یاد کر رہے ہیں۔!"

"اچھا — ابھی آیا —!" غیر ارادی طور پر اس وقت اس کی نظریں ممتاز کے ٹائپ رائیٹر کی طرف اٹھ گئیں۔ اسے ساکت پا کر وہ بیقرار ہوا تھا۔ ایک عجیب سی اداسی نے اس کے چہرے پر پڑاؤ ڈالا۔!

باس کے کمرے میں داخل ہوتے ہی اس کے دل میں کئی وسوسے جنم لینے لگے۔ ممتاز باس کے ٹیبل کے سامنے سر جھکائے پاؤں کے انگوٹھے سے فرش کرید رہی تھی اور باس کا منہ غصے سے تمتما رہا تھا۔

"یہ کیا حرکت ہے —!" سلیم کو دیکھتے ہی وہ سانپ کی طرح پھنکارا جسے باس کے ہاتھ میں دیکھتے ہی وہ سارا معاملہ بھانپ گیا۔ اس نے ملتجانہ نظریں اس کے چہرے سے ہٹا دیں۔ جن میں رحم کی درخواست کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔

"میں پوچھتا ہوں۔ کیا یہ فلم اسٹوڈیو ہے —؟" وہ دوبارہ گرجا۔

"جی معافی ....!" سلیم کی زبان پر الفاظ لڑکھڑا رہے تھے۔

"نہیں — تمہیں اس کی سزا ضرور ملے گی" باس کا فیصلہ کن لہجہ ابھرا۔

"مس ممتاز تم بھی سن لو۔ تم سے بھی کوئی ایسی غلطی سرزد نہ ہو، جس سے دفتر کی بدنامی ہو، اور جو آفس ڈیکورم کے سراسر منافی ہو —!"

"جی —" وہ بمشکل اتنا ہی کہہ سکی۔

"اب تم جا سکتی ہو — اور ہیڈ کلرک کو بھیجدو —!" باس نے تحکمانہ

انداز میں کہا اور مجھے دوبارہ میز پر پٹک دیا۔

سلیم کے کنکریٹ دل پر احسان ہوا یا پانچ سال تک کے لئے اُس کی ترقی روک دی گئی۔ دوسرے جونیئر کلرک کے نصیب جاگ اُٹھے۔ اس حادثے کے بعد ممتاز اس کمرے سے ہٹا لی گئی۔ باس نے اُسے پرسنل ٹائپسٹ مقرر کیا اور اُسے ایک الگ تھلگ کمرہ ملا۔

اس واقعہ کے کوئی پندرہ روز بعد ایک دن ممتاز باس کے پاس کچھ کاغذات دستخط کرانے کی غرض سے لے گئی۔ وہ دستخط کرنے کے ساتھ ساتھ ممتاز کے انگ انگ کا جائزہ اپنی بھوکی نظروں سے لیتا گیا۔ ممتاز سر جھکائے ورق اُلٹتی جا رہی تھی۔ اس لئے اس نے باس کی بھوکی نظروں کو نہ دیکھا۔ اچانک۔۔۔ ایک ورق اُلٹتے اُلٹتے اس کا ہاتھ باس کے کھردرے ہاتھ سے مس ہوا۔ باس کے سارے جسم میں بجلی سی دوڑ گئی۔ اس کے نتھنے پھول گئے اور اس پر ایک عجیب سی رقت طاری ہوئی۔ قلم اس کے ہاتھ سے کب کا چھوٹ چکا تھا۔ ممتاز کی نازک کلائی کب سے اس کی گرفت میں تھی۔ جب اس کے ہونٹوں پر رقصاں شیطانی مسکراہٹ نے انگڑائی لی۔ آنکھوں میں خون تیرنے لگا۔ سانسیں بے قابو ہو گئیں۔ تب ممتاز اس کے جارحانہ ارادوں کو بھانپ گئی۔ اس کی آنکھوں کی شیطانی چمک کی، اور زیادہ تاب نہ لا کر اس نے ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی۔

"سر، چھوڑئیے

"کیوں —— ہم کیا جانتے نہیں —! باس کا لہجہ بڑا ہی بھونڈا تھا۔"
"لیکن سر — ایسی حرکتیں آفس ڈیکورم کے خلاف ہوتی ہیں۔"
ممتاز نے اسے اپنے ہی تیر سے شکار کرنا چاہا۔ لیکن اس وقت اس پر ابلیس سوار تھا۔ اس کی گرفت ڈھیلی پڑ جانے کے بجائے مضبوط ہوتی گئی
"یہ حکم ہمیشہ ماتحتوں کے لئے ہوتے ہیں۔ تمہارے ہمارے لئے نہیں۔ اور پھر بس یہ تھوڑا ہی کہا تھا کہ اس معاملے میں بالکل ہی کمیونسٹ ہو جاؤ۔ اس نے ایک معنی خیز مسکراہٹ اپنے ہونٹوں پر بکھیرتے ہوئے کہا۔
ممتاز اب بھی اپنے آپ کو چھڑانے کے لئے پھڑپھڑا رہی تھی۔ باس نے اسے اپنی باہوں کے حلقے میں بری طرح جکڑ لیا تھا۔ اس کے آگے کا منظر دیکھنے کی تاب مجھ میں نہ تھی۔ میں نے فائلوں میں اپنا منہ چھپانے کی ناکام کوشش کی۔ کیونکہ میں انسان کی ذلالت دیکھنے کی سکت کھو چکا تھا۔ خاص کر ایسے انسانوں کی جو تن ڈھانپنے بھی یہاں الف ننگے لگتے ہیں، بالکل کمیونسٹ!!!

جولائی سنہ ۱۹۷۱ء

# دُھول کے زخم

"نرس —!

رجب شیخ کے ڈوبتے اُبھرتے تنفس کو دیکھ کر میں گھبراہٹ کے عالم میں تقریباً چیخ پڑا۔ اس کی نبض ڈوب رہی تھی، سارا بدن برف کی سِل کی مانند سرد ہو چکا تھا۔ بیچ بیچ میں وہ ٹک ٹک کر رہا تھا کہ جیسے وہ اپنی زندگی کی آخری سانسیں گن رہا ہو۔

میری آواز سُن کر ایک نرس دوڑتی ہوئی آئی۔ اس کی نبض ٹٹول کر اُلٹے پاؤں ہاؤس سرجن کے کمرے کی جانب لپکی۔ میں بڑی بے چینی کے عالم میں اس کے بیڈ کے گرد چکر کاٹتا رہا۔ کبھی اُس کے چہرے کی طرف نگاہ اُٹھتی اور کبھی وارڈ کے کھُلے دروازے کی طرف —!

ڈاکٹر کے آنے میں دیر نہ لگی، اُس نے فوراً نرس کو کوئی انجکشن لانے کو کہا اور خود نبض کی جانچ کرنے لگا۔ رجب کے سانسوں کے ٹوٹتے ہوئے تسلسل کو دیکھ کر اس کے چہرے پر نا اُمیدی کی لکیریں واضح طور پر اُبھر آئیں

"ڈاکٹر کیا یہ بچ جائے گا —!"

"حوصلہ رکھو۔! اس نے میرا شانہ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔
"لیکن ڈاکٹر۔۔؟"

"DON'T BE SILLY MR AJAZ."

اس نے ہمدردی بھرے لہجے میں کہا۔ اسے کسی طریقے سے بچاؤ۔ پلیز ڈاکٹر"
"سوری مسٹر اعجاز۔ ہم سے جو کچھ بھی ہو سکتا تھا، ہم نے کیا۔ آگے خدا...
چند ہی لمحے کشمکش کے اور بس ــــ!
موت زندگی پر غالب آ گئی اور زندگی کے آئینے نے اپنی چمک کھو دی۔"
حبیب شیخ مر گیا ـــ!
زندگی مر گئی ـــ!!
ہسپتال کے لال کمبل نے اس کے گرد سے اٹے ہوئے چہرے کو ڈھک لیا۔
ـــ نہیں نہیں ـــ چہرے کو نہیں بلکہ ان آرزوں کو ڈھانپ لیا جو دھول کے ذروں میں پنہاں تھیں ـ!

---

رجبا اور ریس گگی ڈنڈے کے ساتھی تھے۔
یہ کوئی تیس برس ادھر کی بات تھی۔ ناک سے بہتا ہوا کالا رقیق سیال، پیروں پر میل کی دبیز تہیں، پھٹے پرانے کپڑے اور چہرے پر یتیمی کے سے سائے۔ وہ تھا تیس سال پہلے کا رجبا۔ وہ جس جھونپڑی میں رہتا تھا وہ ہماری کوٹھی کے سامنے تھی۔ ان دنوں میرے ابا اسے دیکھتے ہی ناک بھوں چڑھا لیتے

ہی دیکھتے اچانک لڑکی کا پاؤں پھسل گیا اور وہ پٹڑی پر بیٹھے ہوئے ایک بھنگی پر جاگری
" یو ڈرٹی ڈاگ " (YOU DIRTY DOG)"۔ اس پر برس پڑی۔
" لیکن میم صاحب ۔ " وہ معصومیت سے بول پڑا۔
" چپ سور ۔ شرم نہیں آتی ۔ " وہ دوبارہ پھر اپنے ساتھی کی طرف مڑکے بولی ۔ " ڈارلنگ ذرا اس پولیس والے کو بلانا ۔ میں ابھی اسے سبق سکھاتی ہوں ۔"
میں تب تک تماشائی بنا سب کچھ دیکھ رہا تھا ۔ لیکن جب اس نے اسے پولیس کے حوالے کرنے کی دھمکی دی تو مجھ سے رہا نہ گیا۔
دیکھئے میڈم ۔ قصور اس کا نہیں آپ کا ہے ۔ آپ اس سے معافی مانگیے میں نے اس بھنگی کی طرف اشارہ کیا تھا ، جو ندامت میں سر جھکائے سسکیاں بھر رہا تھا۔
" میں معافی مانگوں ۔ اس گندی نالے کے کیڑے سے ۔ کیوں مسٹر ۔ کیا یہ آپ کا کوئی سگے والا ہے ۔" وہ طنزیہ انداز میں بول پڑی۔
" کیا یہ انسان نہیں ۔ " میری آنکھوں میں خون اتر آیا تھا ۔ " گندی نالی میں رینگنے والے کیڑے تو آپ ہیں یہ نہیں ۔ ! "
" کیا آپ کی وادی میں سیاحوں کے ساتھ یہی سلوک کیا جاتا ہے ۔ ؟ " اس نے اصل معاملے کا رُخ موڑتے ہوئے کہا۔
" سیاح تو ہمارے مہمان ہیں ۔ لیکن آپ جیسے نہیں جو لوگوں کے افراد کو ہی نفرت کی نگاہ سے دیکھیں۔ "
مجھے اس لڑکی سے اُلجھتے دیکھ کر بھنگی نے سسکیاں بھرنی بند کر دی اور

پھٹی نگاہوں سے مجھے دیکھنا شروع کر دیا۔ اُس کے چہرے کو غور سے دیکھتے ہی میں کبوتر پھکارہ گیا۔ میرے ذہن کے نہاں خانوں سے ایک دھندلی تصویر اُبھرنے لگی اور میں بے ساختہ چیخ پڑا۔

"یار رجب تم۔!" وہ بُت بنا میری طرف دیکھتا رہا۔!

"پہچانا نہیں۔ میں اعجاز ہوں۔ اعجاز۔" میں دوبارہ چیخ پڑا تھا۔

"ہونہہ۔ ڈرٹی کشمیریز"۔! اس لڑکی نے ہماری طرف ایک نفرت بھری نگاہ پھینک کر اپنے ساتھی کو گھسیٹتے ہوئے کہا۔

میں اُس لڑکی کو ضرور اُلجھائے رکھتا، اگر مجھے رجبا کے ملنے کی خوشی نہ ہوتی ہم کئی سال بعد ملے تھے۔ ہماری پرانی کوٹھی کی جگہ نئی کالونی میں ایک شاندار کوٹھی نے لی تھی۔ رجبا بھی اپنی وہ پرانی جھونپڑی چھوڑ کر کہیں اور چلا گیا تھا۔ صرف اتنا معلوم ہو سکا تھا کہ اُس نے شادی کی اور سسرال جا کے رہنے لگا تھا۔ اُس کا سسرال کہاں تھا یہ کسی کو خبر نہ تھی۔ اُس کے اچانک مل جانے سے میرا ذہن پر وہ کئی سال پہلے کا رجبا اُبھرنے لگا۔

"یار رجب۔ تم تو کافی بدل گئے ہو۔"

"آپ بھی تو بدل گئے ہیں، اعجاز صاحب۔"

"یہ اعجاز صاحب کیا ہوا۔ ارے تم تو میرے بچپن کے ساتھی ہو۔" ہاں سُنا تھا تمہاری شادی ہوئی، کوئی بچہ......"

"بچہ۔؟" وہ زیرِ لب بڑبڑایا، اُس کے زخموں کو کریدسی لگ گئی اور

وُہ پھُوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

"کیا ہوا۔ تم کیوں رو دیئے۔"

"کچھ نہیں۔ وہ اپنے آنسو میلی قمیض سے صاف کرنے لگا۔

"آؤ میرے ساتھ۔"

"کہاں۔"؟

"آؤ تو سہی۔ تم سے بہت باتیں کرنی ہیں، چل کے کہیں بیٹھتے ہیں۔"

"نہیں، اعجاز صاحب۔"

"چلو۔ ضد نہ کرو۔" میں نے اُسے زبردستی گھسیٹتے ہوئے کہا۔ وہ چار و ناچار میرے پیچھے چلنے لگا اور میں اُسے ایک متوسط درجے کے چائے خانے کی طرف لے گیا۔

"اب سناؤ۔ اتنے سال کہاں رہے۔" میں نے اُسے اپنے مقابل بٹھاتے ہوئے کہا۔

"اتنے سال۔" وہ ہرگز اسلم کی آواز نہ تھی بلکہ ماضی کے دھندلکوں میں ڈوبے ہوئے ایک ایسے انسان کی مُردہ آواز، جسے دُکھوں نے نڈھال کر دیا ہو، جیسے بہت دُور سے کوئی نحیف آواز اُبھر رہی تھی۔

"اتنے سال مجھ پہ پہاڑوں کی طرح ٹوٹ پڑے ہیں۔ میری شادی ہی دراصل میری مصیبتوں کی ابتدا تھی۔ شادی کے کئی روز بعد ہی مجھ پر یہ راز کھُلا کہ منکوحہ ایک ناجائز بچے کی ماں بننے والی ہے۔ میں اندر ہی اندر سلگتا رہا۔

اُف تک نہ کی۔ کیونکہ تیر کمان سے چل چکا تھا۔ تقریباً چھ ماہ بعد اُس نے ایک مُردہ بچے کو جنم دیا اور وہ مجھ سے کھنچی کھنچی رہنے لگی۔ دو سال کے ان ہی ماحول میں ہی ہماری ایک لڑکی ہوئی۔ لیکن منغلی میرے قریب آنے کی بجائے مجھ سے دُور ہوتی گئی اور آخر ایک دن ہسپتال جانے کے بہانے گھر سے جو نکلی تو دوبارہ پلٹ کر نہ آئی۔ میں نے اُسے ہر جگہ تلاش کیا۔ شیر خوار بچی ماں کی ممتا کو ترس گئی، میری بوڑھی ماں نے اُسے پالا۔ اب لگ بھگ گیارہ سال گذر گئے ہیں۔ میں اُس بچی، ذوتن اور بوڑھی ماں کے ساتھ بٹالوں کی ایک حیدو بیڑی میں رہتا ہوں۔"

زینب شیخ نے اپنی زندگی کے اُس المناک باب پر سے پردہ سرکایا تھا جس سے میں قطعی نا آشنا تھا۔ ایک سرد آہ بھر کر اُس نے دوبارہ کہنا شروع کیا۔ "میں نے اپنی بِپتا تو سنائی۔ لیکن آپ۔ آپ نے اپنے متعلق کچھ نہیں بتایا۔ آپ آج کل کیا کر رہے ہیں۔؟"

"میں۔ میں بھی تمہارا ہی جیسا کام کرنے کی کوشش کرتا ہوں، ویسے پڑھائی مکمل کر لی ہے۔"

"تمہارا ہی جیسا کام۔ میں کچھ سمجھا نہیں۔"

"ہاں بھئی، صفائی کا کام۔ فرق صرف اتنا ہے کہ تمہارے ہاتھ میں جھاڑو ہے اور میرے ہاتھ میں قلم۔ میں ایک ادیب ہوں۔ ادیب کا مطلب سمجھتے ہو نا۔؟"

"لنڈا، ادیب اور صحافی۔" اس نے حیرت سے پوچھا تھا۔

" اس میں حیرانگی کی کونسی بات ہے۔ جیسے تم جھاڑو سے گندگی صاف کرتے ہو، بالکل اسی طرح میں بھی قلم سے سماج کی گندگی دُور کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔"

میں اُسے سمجھانے لگا تھا۔

پھر ایک روز وہ مجھے لال چوک میں ملا۔ چہرہ اندر کو دھنسا ہوا۔ زرد سی رنگت۔ مجھے اُس کی صورت پہچاننے میں وِقت سی محسوس ہوئی۔

" ارے رجب۔ یہ کیا حالت بنا رکھی ہے۔ بیمار ہو گیا۔ ؟"

" ہاں، ۔" وہ بُری طرح کھانسنے لگا تھا۔" آج ہی ہسپتال گیا تھا۔ کل ایکسرے کے لئے دُوبارہ جانا ہے۔۔"

" ایکسرے "۔ میں نے مضطرب ہو کر پوچھا تھا۔" یہ کھانسی تمہیں کب سے ہے؟"

" یہی کوئی تین سال سے۔ لیکن اِدھر کوئی مہینے بھر سے سینے میں ایک عجیب سا دَرد اُٹھ رہا ہے۔"

اس کے دوسرے روز جب مجھے اس کی ایکسرے رپورٹ ڈاکٹر کی زبانی معلوم ہوئی تو میرے دماغ کو ایک جھٹکا سا لگا۔ اُس کے پھیپھڑے بالکل ناکارہ ہو چکے تھے جو کسی بھی وقت کام کرنا چھوڑ سکتے تھے۔

رجب کو اُسی روز ہسپتال میں ایڈمیٹ کیا گیا اور صرف ۲۴ گھنٹوں کے اندر اُس کے پھیپھڑوں نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔

رجب شیخ مر چکا تھا۔!

زندگی مر چکی تھی۔!!

اور اُس ہسپتال کے لال کمبل نے اُس کے گرد سے اَٹے ہوئے چہرے کو ڈھک لیا تھا۔!!!

رحیم شیخ کو مرے ہوئے ایک سال ہوا تھا۔ ریگل چوک سے گذرتے ہوئے ایک بھنگن کو دیکھ کر اچانک مجھے خیال آیا تھا۔ ہوا یوں تھا کہ ایک سیاح لڑکی پائنتن پر بڑی طرح برس رہی تھی، اُس نے غلطی سے کیچڑ اُس کے کپڑوں پر اُچھال دیا تھا۔ بھنگن گڑگڑا کر اُس سے معافی مانگ رہی تھی اور وہ لڑکی نفرت بھری نگاہوں سے کبھی اُس کی طرف دیکھتی اور کبھی بڑھتی ہوئی بھیڑ کو۔“

میں نے جو غور سے بھنگن کو دیکھا تو مارے حیرت و حسرت کے میری آنکھیں کھُلی کی کھُلی رہ گئیں۔

وُہ بھنگن۔ رحیا کی بیٹی زونی تھی۔ !

میری آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب اُمڈ آیا اور میں رُومال آنکھوں پر رکھ کر قریب کے ایک چائے خانے میں گھُس گیا۔!“

## آندھی، طوفان بن گئی

م، م صدیقی کی کہانیاں پڑھی تھیں، لیکن ان کی ذات سے متعارف نہ ہوا تھا

پھر کبھی کبھی سوچتا۔ کاش! صدیقی سے ملاقات ہو جاتی۔ اور میں کہوں ان سے۔ اپنے

میرے بھائی گردشِ ایام کو ٹھوکر مار کر اپنی کہانیوں کا ایک مجموعہ چھاپ دو، تا کہ جو

جدید ادب کا ایک پرچم لہرا دے۔

اور یہ اتفاق ہی سمجھئے کہ م، م صدیقی ایک آندھی کی طرح ملا۔ متعارف

ہوا۔ اور خود ہی بول اٹھا — کہانیوں کا "سیبن" کرنے لگا ہوں — اور میں نے

سمجھا آندھی طوفان بن جائے گی۔

اور — مسرت آمیز بات یہ ہے کہ م، م صدیقی اور محترمہ رقیبہ تبسم

کے تخیل کی اڑان مجھے ایک "احساس کا گھاؤ" دے کر چلی گئی —

یہ "احساس کا گھاؤ" — درحقیقت انسانی مجبوریوں اور مقہوریوں

کا ایک سنگم ہے جدیدیت کے نام پر — کہ جس میں — میرے جذبات و

احساسات کا ایک "گھاؤ" رقص پذیر ہے۔

راج ٹھاکور

پرنس ہوٹل — پریڈ گراؤنڈ — جموں

بند پڑی مٹھیاں کُھل گئیں۔ کھلے، مسلے شگوفے سفید گھاس پر بکھر گئے۔ روحی حسرت بھری نگاہوں سے اُن کھلے مسلے شگوفوں کو دیکھنے لگی۔

وہ لڑکیوں کے جھرمٹ سے دور نکل آئی اور قدم پاگل خانے کی اُن آہنی سلاخوں والی کوٹھڑیوں کے قریب جا رکے۔ کچھ، سنجیدہ چہرے۔ کچھ، روتی صورتیں اور کچھ، کھوکھلی مسکراہٹیں۔

وہ قدم آگے بڑھاتی گئی۔ لیکن آخری کھڑکی کے پاس اُسکے قدم جم گئے۔ اگر اُسنے آہنی سلاخوں کا سہارا نہ لیا ہوتا تو دھڑام سے گر گئی ہوتی۔

......۔ کانپتے ہونٹوں سے صرف ایک اُدھورا لفظ ادا ہوسکا—"سا......!!"